کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

- ازروئے قرآن حکیم ہمارا دین کیا ہے؟
- ہماری دینی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
- نیکی، تقویٰ اور جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے؟

تو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے جاری کردہ

خط و کتابت کورس :

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی

سے استفادہ کیجئے!

نیز

اللہ کے پر تاثیر کلام سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہونے کی خاطر

عربی زبان سیکھنے کیلئے، اس کے ابتدائی قدم کے طور پر

عربی گرائمر خط و کتابت کورس (حصہ اول و دوم)

میں داخلہ لیجئے!

مزید تفصیلات اور پراسپکٹس کے حصول کے لئے رابطہ کیجئے :

شعبہ خط و کتابت کورسز، قرآن اکیڈمی، 36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5869501

اکیڈمی / لائبریری

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۵ | شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ جنوری ۱۹۹۶ء | شمارہ ۱

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل مصل شاہ بحری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور۔

سلسلۂ تعارفِ تعارف الکتاب

ڈاکٹر اسرار احمد

وَلَوۡ اَنَّنَا ۸

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝ (الانعام:۱۱۱)

قرآن مجید کا آٹھواں پارہ "وَلَوْ اَنَّنَا" کے الفاظ سے شروع ہوتا اور اسی نام سے موسوم ہے۔ یہ پارہ دو برابر برابر حصّوں میں منقسم ہے۔ اس کے نصفِ اول میں سورۃ الانعام کی بقیہ پچپن (۵۵) آیات وارد ہوئی ہیں، اور نصفِ ثانی میں سورۃ الاعراف کی ستاسی آیات ہیں۔ سورۃ الانعام کا جو حصّہ اس پارہ میں وارد ہوا ہے اس میں ابتداءً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ دل گیر نہ ہوں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تو اپنی شرافتِ طبع اور مروت کی بناء پر یہ احساس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا سبب کہیں میرے ابلاغ اور تبلیغ اور دعوت و نصیحت میں کسی اعتبار سے کوئی تقصیر تو نہیں ہے، اور دوسرے جیسا کہ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں بھی آیا، کفّار کی طرف سے جب مطالبہ کیا گیا کہ ہمیں معجزات دکھائے جائیں تو ہم ایمان لے آئیں گے، تو اس پر بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال بربنائے طبع بشری پیدا ہوا کہ کیوں نہ انہیں ان کی پسند کے معجزات دکھا ہی دیئے جائیں اور ان کے مطالبات پورے کر دیئے جائیں، کیا عجب کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور اگر ایمان نہ لائیں تب بھی کم از کم ان پر حجت تو قائم ہو جائے۔ اس پارے کے آغاز میں فرمایا کہ اس خیال میں کوئی حقیقت نہیں۔ انہیں اگر تمام معجزے بھی دکھا دیئے جائیں، وہ تمام چیزیں جن کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں پوری کر دی

جائیں تب بھی یہ ماننے والے نہیں۔

اس کے بعد مشرکینِ عرب اور قریشِ مکہ کی ان بدعات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا جو انہوں نے دینِ ابراہیمی میں اپنے جی سے گھڑ کر شامل کر لی تھیں' چنانچہ کھانے پینے کی چیزوں میں ایک لمبا چوڑا ضابطہ انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر دینِ ابراہیمی کے نام سے نافذ کر دیا تھا۔ اس کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے۔ اور آخر میں بڑی جامعیت کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ: تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ۔ (الانعام: ۱۵۲) آؤ میں تمہیں بتاؤں تمہارے رب نے کن چیزوں کو حرام کیا ہے؟ دینِ ابراہیمی کے اصل اصول کون سے ہیں؟ شریعتِ آسمانی کے اصل اور بنیادی احکام کون سے ہیں؟ یعنی یہ کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو' والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ' چوری سے بچو' یتیموں کا مال ہڑپ کرنے سے باز آؤ' اسی طریقے سے فواحش سے بچو' اور بھی جو بنیادی اخلاقی تعلیمات ہیں ان سب کو بڑی جامعیت کے ساتھ اس مقام پر ان سب لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ یہ ہے اصل دین: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ۔ (الانعام: ۱۵۳) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے' یہی اصل ملتِ ابراہیمی ہے اور یہی وہ امور ہیں کہ جن کی طرف میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔

آخر میں روحِ دین کے اعتبار سے بڑی جامع بات ہے کہ حضورؐ کو حکم ہوا کہ آپؐ یہ فرما دیجئے: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳) میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت' یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہیں۔ انسان کی پسند اور ناپسند کا معیار واحد اللہ کی پسند ہے۔ یہ ہے اصل دین اور یہ ہے دین کی اصل حقیقت اور اس کی اصل روح۔

اس کے بعد سورۃ الاعراف کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی استعمال کردہ اصطلاح "اللہ کے یام اللہ" کی بڑی حسین و جمیل ایک مثال ہے' یعنی نسلِ انسانی کی تاریخ کے اہم واقعات سے استشہاد جس میں انبیاء و رسل کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کا اکثر و بیشتر حصہ تاریخ انسانی کے اہم واقعات پر مشتمل ہے

پہلا رکوع بہت جامع ہے اور اس میں وہ آیت بھی وارد ہوئی ہے: فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْھِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ (الاعراف: ۶) "ہم باز پرس کریں گے اور محاسبہ کریں گے ان کا بھی جن کی طرف ہم نے رسولوں کو بھیجا اور ہم پوچھیں گے ان سے بھی جنہیں ہم نے رسول بنا کر بھیجا۔"

اس کے بعد کے دو رکوع میں قصۂ آدم و ابلیس بیان ہوا ہے اور اس کے بعض دوسرے پہلو، جو سورۃ البقرہ کے چوتھے رکوع میں بیان ہوئے جہاں یہ قصہ قرآن مجید میں ابتداءً آیا، مگر اس کے بعض پہلو تشنہ رہ گئے تھے، ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ نسلِ انسانی کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارا ازلی اور ابدی دشمن شیطان لعین وہی ہے کہ جس نے تمہارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام اور تمہاری اماں حوا علیہا السلام کو جنت سے نکلوایا تھا اور اب بھی وہ درپے ہے کہ تمہیں دوبارہ جنت میں داخل نہ ہونے دے۔ اپنے اس دشمن کو پہچانو!

ابتدائے آفرینش یا یوں کہیے کہ نسلِ انسانی کے آغاز کے ان واقعات کے بعد نسلِ انسانی کے اُخروی انجام کا ذکر ہوا۔ چنانچہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ نسلِ انسانی کس انجام سے دوچار ہونے والی ہے۔ ان میں کچھ خوش قسمت لوگ وہ بھی پیدا ہوں گے کہ جو اللہ کی رحمت کے دامن میں جگہ پائیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے، فَرَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِیْمٍ ۔ ان کا مقسوم بنے گا اور کچھ بدقسمت لوگ وہ ہوں گے جو جہنم میں داخل کیے جائیں گے اور عذاب شدید میں مبتلا کیے جائیں گے ساتھ ہی ذکر ہوا اصحاب اعراف کا۔ یہ گویا نسلِ انسانی کی تاریخ کے بالکل آخری دور کے واقعات ہیں۔

اس کے بعد شروع ہوتا ہے انبیاء و رسل کی تاریخ کا سلسلہ۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام جو قوم عاد کی طرف بھیجے گئے، حضرت صالح علیہ السلام جو قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا کہ یہ سب نوعِ انسانی کو حق کی طرف دعوت دیتے ہوئے آئے، توحید کی طرف بلانے کے لیے آئے، بداعمالیوں سے، فواحش و منکرات سے روکنے کے لیے آئے۔ لیکن انسان اپنی بدبختی میں، اپنی سرکشی میں، اپنے تکبّر میں کفر و انکار اور انحراف پر اڑا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام قوموں پر

ہلاکت کا عذاب یعنی عذابِ استیصال نازل ہوا۔ قومِ نوح کو غرق کیا گیا، قومِ عاد اور ثمود بھی اسی طرح تباہی سے دوچار ہوئیں، قومِ لوط پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی اور ان کی بستیاں برباد کر دی گئیں۔ یہ تمام حالات و واقعات ایک ہی حقیقت کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں کہ کامیابی اس دنیا میں بھی بالآخران ہی کے حصے میں آنے والی ہے جو خدائے واحد کے پرستار ہوں، انبیاء و رسل کی دعوت کو قبول کریں، اُن پر لبیک کہیں، نیکی اور صداقت، راستبازی اور راست روی کو اختیار کریں۔ اور بربادی مقدر بنتی ہے اس دنیا میں بھی ان کا جو دنیا میں اس کے برعکس روش اختیار کریں اور آخرت میں تو وہ دردناک انجام سے دوچار ہونے ہی والے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن !

بقیہ : حرفِ اول

بڑی روانی کے ساتھ انگریزی میں درسِ قرآن دیتے اور اجتماعاتِ جمعہ سے خطاب فرماتے ہیں۔ چنانچہ اب انگریزی زبان میں بھی ان کے دروس و خطابات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور اس طرح زبان و بیان کی حد تک رجوع الی القرآن کی اس دعوت کی انگریزی میں منتقلی کا بہت حد تک سامان ہو گیا ہے --- دوسری جانب اسی ضرورت کے پیشِ نظر ہم نے کچھ عرصہ پیشتر "حکمت قرآن" میں انگلش سیکشن کا اضافہ کیا تھا اور اس امر کا اہتمام کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہر ماہ کوئی ایک نہ ایک مضمون بزبان انگریزی بھی پرچے میں شامل کیا جائے، تاہم یہ اقدام بھی حصولِ مقصد کے اعتبار سے ناکافی تھا۔ اب بحمد اللہ، قرآن اکیڈمی لاہور میں "انگریزی سیکشن" کا باقاعدہ قیام عمل میں آچکا ہے۔ جس کے تحت ان شاء اللہ بہت جلد ایک سہ ماہی انگریزی جریدے کا اجراء عمل میں آجائے گا۔ ہماری پوری کوشش ہو گی کہ اس جریدے کو جس کا نام "The Quranic Horison" تجویز کیا گیا ہے، معنوی اور ظاہری ہر دو اعتبارات سے اعلیٰ معیار پر شائع کیا جائے۔ اس پرچے کی ادارت کے ضمن میں کام کا زیادہ بوجھ ہمارے نوجوان ساتھی ڈاکٹر احمد افضال پر آئے گا جو انگریزی سیکشن کے انچارج ہیں۔ السعی منا والاتمام من اللہ OO

رمضان المبارک اور اس کی خصوصیات

تحریر : مولانا عبدالغفار حسن

رمضان کا مبارک اور مقدس مہینہ جن خصوصیات اور محاسن کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے' ان سب کی تفصیل تو اس مضمون میں ناممکن ہے۔ اس موقع پر صرف چند اہم اور نمایاں خصوصیات روزہ' قیام اللیل' اجتماعیت' تلاوت قرآن' دعا' انفاق فی سبیل اللہ' لیلۃ القدر اور اعتکاف کی تشریح اور تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے ان کے نتائج اور ثمرات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

روزے کے ثمرات : (۱) روزے کا پہلا ثمرہ ایمان کی از سر نو تازگی اور شادابی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات خصوصاً اس کے علیم و خبیر اور مالک یوم الدین ہونے پر جس طرح روزہ یقین پیدا کرتا ہے وہ اپنی تاثیر کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ روزے کی حالت میں بھوک پیاس کی شدت اور جنسی خواہشات کے ہیجان پر وہی شخص قابو پا سکتا ہے جو مذکورہ بالا خدائی صفات پر ایمان رکھتا ہو۔ قانون کے ڈنڈے اور پولیس کے پہروں کے بغیر ایک مسلمان اپنے ایمانی تقاضے کی بنا پر اس فرض کو انجام دے سکتا ہے اور یہ چیز اس کی ایمانی قوت و حرارت میں مزید اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ افراد کی اصلاح کے لئے دو قسم کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ (۱) باطنی یعنی قلبی کیفیات اور اندرونی حالت میں انقلاب و تبدیلی پیدا کی جائے (۲) ظاہری یعنی بیرونی دباؤ اور تعزیری قوانین کے ذریعے برائیوں کو روکنے اور نیکیوں کو نشو و نما دینے کی کوشش کی جائے۔

اسلام نے یہ دونوں طریقے اختیار کئے ہیں لیکن اس نے پہلے زیادہ توجہ باطنی اصلاح پر دی ہے' جیسا کہ حدیث میں ہے :

((الا ان فی الجسد مضغہ' اذا صلحت صلح الجسد

کلہ' واذا فسدت فسد الجسد کلہ' الاوھی القلب))

(بخاری و مسلم' مشکوٰۃ ج ا' ص ۲۴۱)

"""سنو! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے' اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارے جسم میں بگاڑ ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو یہ لوتھڑا دل ہے"۔

قلبی کیفیات کو بدلنے اور پاکیزہ میلانات کو پیدا کرنے کے لئے نماز کے بعد اگر کسی عبادت کا مقام ہو سکتا ہے تو وہ روزہ ہے۔

(۲) روزے کا دوسرا پھل اخلاص ہے۔ دوسری عبادات کا علم کسی نہ کسی طرح دوسرے افراد ہو سکتا ہے' لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جب تک خود روزہ دار ہی اپنی زبان سے اس کا اظہار نہ کرے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اس عبادت میں ریاکاری اور نمائش کا کم سے کم امکان پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

((الصوم لی وانا اجزی بہ)) (بخاری و مسلم' مشکوٰۃ ج ا' ص ۱۷۳)

"""روزہ میرے لئے ہے' اور میں ہی اس کی جزا دوں گا"""۔

(۳) روزے کی بنا پر انسان میں صبر یعنی ضبط نفس اور اپنی خواہشات پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک حدیث میں رمضان کے بارے میں فرمایا گیا ہے : ((ھو شھر الصبر)) یعنی "یہ صبر کا مہینہ ہے"۔ یہ بھی واضح رہے کہ اصحاب صبر کے لئے خدا کے ہاں ثواب بھی ان گنت ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

﴿ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ ﴾

(الزمر : ۱۰)

"صبر والے خدا کے ہاں اپنا اجر بے حساب پائیں گے"۔

(۴) روزے کی وجہ سے انسان میں جذبہ شکر ابھرتا ہے اور خدا کی نعمتوں کی قدر و منزلت اسے معلوم ہوتی ہے اور پھر یہ جذبہ اپنے محسن حقیقی کی محبت سے وابستہ کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مقام محبت حاصل ہو جائے تو پھر عبادت و اطاعت کی مثالیں بھی دو چند

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے :

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

(البقرہ : ۱۸۵)

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت کی نعمت تمہیں بخشی ہے اس پر تم اس کی بڑائی بیان کرو تاکہ تم (احسانات کا) شکر ادا کرو۔

اسی جذبہ شکر کو ابھارنے کے لئے ایک حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ دنیاوی لحاظ سے ان لوگوں کو دیکھو جو تم سے کم تر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم ان نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو گے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی ہیں (بخاری، مسلم، مشکوۃ ج ۲، ص ۴۴۷)

روزے کے افطار کے وقت خاص طور پر اس دعا کے پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے :

اللھم لک صمت وعلی رزقک افطرت، ذھب الظماو ابتلت العروق وثبت الاجر ان شاء اللہ تعالی (ابوداؤد، مشکوۃ ج ۱، ص ۱۷۵)

"اے اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے دیئے ہوئے رزق پر میں نے افطار کیا۔ پیاس بجھ گئی رگیں تر ہو گئیں اور خدا کے ہاں اجر ثابت ہو گیا ان شاء اللہ"۔

اس دعا میں بھی اعتراف نعمت ہے اور جذبہ شکر ابھارنے کی نمایاں طور پر تربیت دی گئی ہے۔

(۵) روزہ انسان میں ہمدردی اور غم خواری کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جس نے روزے دار کو روزہ افطار کرا دیا تو اس کو بھی روزے دار کے برابر ثواب ملے گا۔ اور جس نے پیٹ بھر کر کسی روزے دار کو کھانا کھلایا اسے اللہ تعالیٰ حوض کوثر کا جام پلائے گا کہ میدان محشر میں پیاس ہی محسوس نہ ہوگی اور جس نے اپنے غلام یا ماتحت شخص سے کام لینے میں نرمی برتی، اللہ تعالیٰ اس کی گردن کو جہنم سے آزاد کر دے گا۔ (بیہقی، مشکوۃ ج ۱، ص ۱۷۴)

قیام اللیل : رمضان المبارک کی دوسری خصوصیت رات کا قیام یعنی شب بیداری

ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے :

من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه (بخاری و مسلم، مشکوۃ ج ۱، ص ۱۷۳)

"جس نے رمضان میں ایمان کی بنا پر اور ثواب کی امید میں قیام اللیل کیا اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے"۔

قیام اللیل میں نفس کی تربیت جس طرح ہوتی ہے اس کی وضاحت اس انداز سے کی گئی ہے :

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝﴾ (مزمل : ۶)

"بلاشبہ رات کا اٹھنا، نفس کو کچلنے اور بات کے درست ہونے کے لئے زیادہ سازگار ہے"۔

رات کے آخری حصہ میں نرم گرم بستر چھوڑ کر اللہ کی یاد کے لئے اٹھنا نفس پر انتہائی شاق گزرتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پر سکون فضا میں اپنے رب سے مناجات اور سرگوشی کرنے میں جو لطف حاصل ہو سکتا ہے اس کا دسواں حصہ بھی دن کے ہنگامہ پرور اوقات میں میسر نہیں آسکتا۔

رسول اللہ ﷺ یوں تو دوسرے مہینوں کی نسبت رمضان میں شب بیداری کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا کرتے تھے، لیکن آخری عشرے میں آپ ﷺ کی جدوجہد اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی، جیسا کہ حدیث میں ہے :

اذا دخل العشر الاخر شد میزره واحیا لیله وایقظ اهله، (بخاری و مسلم، مشکوۃ ج ۱، ص ۱۸۲)

"جب (رمضان کا) آخری عشرہ شروع ہوتا تو آپ اپنی کمر کس لیتے، رات جاگ کر گزارتے اور گھر والوں کو بھی بیدار کرتے"۔

قرآن کا دور : رمضان المبارک کی تیسری خصوصیت اس ماہ میں نزول قرآن ہے، جیسا کہ ارشاد ہے :

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرہ : ۱۸۵)

"رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا"۔

یہ انداز بیان ظاہر کر رہا ہے کہ رمضان اور قرآن کا آپس میں گہرا تعلق ہے' حقیقت یہ ہے کہ رمضان قرآن کی سالگرہ منانے کا مہینہ ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ اس مہینے میں جبرئیلؑ کے ساتھ قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے۔ آخری سال آپؐ نے دوبار دور فرمایا : (صحیح بخاری' مشکوٰۃ ج ۱' ص ۱۸۴)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کو پوری تیزی کے ساتھ بے سمجھے بوجھے تراویح میں پڑھ لیا جائے' بلکہ قرآن مجید کا حق صحیح معنی میں اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ اس کے نزول کے تین مقاصد پیش نظر رکھے جائیں۔

(۱) ﴿لِتَقْرَأَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ﴾ (بنی اسرائیل : ۱۰۶)

(۱) "ہم نے قرآن کو اتارا ہے تاکہ اسے آپ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھیں"۔

(۲) ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ﴾ (ص : ۲۹)

(۲) "ہم نے برکت والی کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔ اور تدبر سے کام لیں"۔

(۳) ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ (النساء : ۱۰۵)

(۳) "ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتار دی تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو راہ آپ کو دکھائے ہیں اس کے مطابق آپ فیصلہ کریں"۔

یعنی انسان اپنے نفس پر' اپنے گھر پر' ماحول پر' پورے ملک پر' بلکہ پوری دنیا پر' اللہ تعالیٰ کی کتاب کے غلبہ اور حکمرانی کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگ جائے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور معاشرہ کا کوئی حصہ بھی اس کی رہنمائی سے خالی نہ رہے۔

انفاق فی سبیل اللہ : رمضان المبارک کی چوتھی خصوصیت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے :

اطلق کل اسیروا عطی کل سائل (بیہقی، مشکوۃ ج ۱، ص ۱۷۴)

"(رسول اللہ ﷺ اس ماہ) تمام قیدیوں کو آزاد فرما دیتے اور ہر سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے"۔

دوسری حدیث میں آپ کی سخاوت کو کثرت و زیادتی کے لحاظ سے تیز ہوا (الریح المرسلہ) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ (بخاری و مسلم، مشکوۃ ج ۱، ص ۱۸۳)

اللہ تعالیٰ کے احسانات خصوصاً نعمت قرآن کا شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس ماہ میں کثرت سے غرباء و مساکین کی مدد کی جائے اور نیک کاموں میں آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ اسی طرح روزے دار اس ماہ میں اپنے دل سے بخل کے میل کچیل کو دور کر سکتا ہے اور اسے سخاوت و فیاضی کا خوگر بنا سکتا ہے۔ ان تمام خصوصیات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کے ذریعے عبادت خالق اور خدمت خلق دونوں کی تربیت دی گئی۔

اجتماعیت : رمضان المبارک کی پانچویں خصوصیت اس میں اجتماعیت کا پہلو ہے۔ یہ وہ فضیلت ہے جو رمضان المبارک کے تمام احکام و عبادات میں نمایاں ہے۔ روزہ رکھنے کا معاملہ ہر شخص کے صوابدید پر نہیں چھوڑ دیا گیا' تاکہ اس طرح سب مسلمان ایک ہی وقت میں سحری کھائیں اور افطار کریں۔ اس حالت میں اگر کسی کا دل روزے کی طرف راغب نہ بھی ہو تو تب بھی ماحول اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ روزے کی سعادت سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس اجتماعی حکم کی بنا پر کمزور ایمان والے بھی ایمانی قوت کا سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں اور عمل صالح کی کھیتیوں کو سرسبز و شاداب بنا سکتے ہیں۔

لیلتہ القدر : رمضان کی چھٹی خصوصیت لیلتہ القدر ہے۔ اس رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ (سورۃ القدر' پ ۳۰) اس رات کو مندرجہ ذیل دعا پڑھنا مسنون ہے :

اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی

(ترمذی' مشکوۃ ج ۱، ص ۱۸۲)

"اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے' معافی کو پسند کرتا ہے' پس تو میری خطائیں

معاف فرما"۔

عام طور پر ستائیسویں شب ہی کو شب قدر سمجھا جاتا ہے' حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کی پانچ طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات شب قدر ہوتی ہے۔ اس لئے ان پانچ راتوں کو خاص طور پر عبادت و تلاوت اور ذکر الٰہی میں گزارنا چاہئے۔

اعتکاف : رمضان المبارک کی ساتویں خصوصیت اعتکاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آخری سال آپؐ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ (صحیح بخاری' مشکوۃ ص ۱۸۳۔ ج ۱)

اسلام نے رہبانیت (ترک دنیا) سے منع کیا۔ لیکن انسان کی یہ خواہش بھی فطری ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ گوشہ تنہائی میں اپنے رب سے سرگوشیوں میں مصروف ہو اور اس کے حضور میں گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور آئندہ کے لئے از سر نو اطاعت و وفاداری کا عہد و پیمان باندھے۔ اعتکاف کو مستحب قرار دے کر اس خواہش کو پورا کیا گیا ہے۔

دعا : رمضان المبارک کی آٹھویں خصوصیت دعا ہے۔ قرآن مجید میں رمضان المبارک کے احکام و فضائل کو بیان کرتے ہوئے درمیان میں دعا کا ذکر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ .... ﴾

(البقرہ : ۱۸۶)

یعنی "جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں (تو ان سے کہہ دو کہ) میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی پکار کو میں سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ پس لوگوں کو چاہئے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں"۔

قرآن مجید کا یہ انداز بیان ظاہر کر رہا ہے کہ رمضان اور دعا میں انتہائی گہرا ربط پایا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

اسلام اور شخصیت پرستی

پر مولانا آزاد کا تفسیری تبصرہ

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی

اسلام نے خداوند عالم کے لئے بطور معبود و حاکم کے توحیدِ خالص کا تصور دے کر اور اقرارِ توحید کو کلمۂ اسلام کا پہلا اساسی جزو قرار دے کر مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حکمرانوں کی آقائیت اور خدائی کی ظلمت سے نجات دلائی اور اس عقیدۂ توحید نے انسان کے اندر احترام انسانیت' آزادی رائے و فکر اور سیاسی جمہوریت کی روح پھونکی اور پھر ان اعلیٰ اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کر کے دنیا کے غلام اور مجبور انسانوں کو دعوتِ حق اور دعوتِ انقلاب دی۔ لیکن پھر قانون قدرت کے مطابق امتِ توحید پر زوال آیا اور اس امت میں مذہبی آقائیت اور سیاسی ملوکیت دونوں فتنوں نے سر اٹھایا۔ ان فتنوں کے خلاف اصلاح و تجدید کی جدوجہد کے لئے ہر دور میں مصلحین کھڑے ہوئے۔ بارہویں صدی ہجری اور اٹھارہویں صدی عیسوی (شاہ صاحب کی وفات ۱۱۷۶ھ' ۱۷۶۲ء) میں جس ہستی نے اصلاحِ امت کے لئے قدم اٹھایا وہ حضرت امام شاہ ولی اللہؒ تھے۔

شاہ صاحب کے بعد ان کی نسبی اور معنوی اولاد شاہ صاحب کے مشن کو چلاتی رہی اور بیسویں عیسوی کے شروع میں جماعت ولی اللّٰہی کی جس نابغۂ روزگار ہستی نے پوری مجددانہ آن بان سے وہ انقلابی صدا بلند کی وہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تھے۔ یوں تو الہلال و البلاغ کا ہر صفحہ اسلام کے انقلابی پیغام کا ترجمان تھا اور مولانا آزاد نے اسلامی تعلیمات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے شخصی کردار کے انقلابی پہلو کو اپنے پورے ادبی جلال کے ساتھ مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا' لیکن حضورؐ کی زندگی کے اس پہلو پر مولانا کی اجتہادی جرأت و قوت نے کمال کر دکھایا جہاں ایک طرف حضورؐ کی شخصی عظمت

کا سوال تھا اور دوسری طرف حضور ﷺ کے انقلابی پیغام اور اسلامی اصول کی حفاظت کا مسئلہ تھا۔ زیر نظر مضمون میں اسی پہلو کی وضاحت کی گئی ہے۔

مختلف مذہبی قوموں کی گمراہی کا نقطۂ آغاز یہ تھا کہ انہوں نے مذہبی پیشواؤں کی شخصی عظمت کے مقابلہ میں ان کے پیغامِ صداقت کو نظرانداز کر دیا۔ اور یہ ان موقعوں پر ہوا جہاں بظاہر داعی اور اس کی دعوت کے درمیان ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی۔ حالانکہ یہ ان قوموں کا امتحان تھا' مگر وہ قومیں اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امت (جماعتِ صحابہؓ) بھی اس آزمائش سے گزری اور وہ اس آزمائش میں کامیاب رہی اور اس کامیابی کا سہرا محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ تعلیم و تربیت کے سر ہے۔

غزوۂ احد کا واقعہ : غزوۂ احد میں تیرانداز جماعت کی طرف سے سپہ سالار لشکر (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت کو نظرانداز کرنے کے نتیجہ میں صحابہ کرامؓ کو غیر معمولی ہزیمت اٹھانی پڑی' بڑے بڑے ستر مجاہد شہید ہو گئے' رسولِ پاک ﷺ ابن قمیّہ کے پتھر سے زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر پڑے' عام نظروں سے غائب ہونے کی وجہ سے دشمنوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ محمد (ﷺ) قتل کر دیئے گئے۔ اس افواہ نے صحابہ کرامؓ کے حوصلے بالکل پست کر دیئے' میدان جنگ میں ابتری پھیل گئی' ایک مہاجر نے ایک انصاری سے کہا (یہ انصاری خون میں لتھڑے ہوئے تھے) "کیا تمہیں خبر نہیں کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ قتل کر دیئے گئے؟"---وہ انصاری بولے :

ان کان محمدٌ اقد قُتِلَ فقد بلّغ فقاتِلُوا عن دینکم

(ابن کثیر جلد ۱ ص ۴۰۹)

"اگر محمد (ﷺ) قتل کر دیئے گئے تو وہ اپنے خدا کے پاس پہنچ گئے' اب تم اپنے دین کی حفاظت کے لئے دشمنوں سے قتال کرو"۔

یہ حضرت انس صحابیؓ کے چچا' انس ابن نضرؓ تھے۔ یہ غیور صحابی اعلان حق کر کے دشمنوں سے لڑے اور شہید ہو گئے۔ مجاہدین میں ابتری دیکھ کر حضور ﷺ نے آواز دی : "اِلَیَّ عِبادَ اللّٰہ' اَنَا رسولُ اللّٰہ" (اے بندگانِ خدا میرے پاس آؤ' میں خدا کا رسول

ہوں اور زندہ ہوں)

صحابہ کرامؓ لوٹ پڑے اور میدان جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔

غزوۂ احد کے بعد خدا تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کیا اور حضور ﷺ کے قتل کی افواہ پر صحابہ نے جو کمزوری دکھائی اس پر صحابہ کرام کو ایک اصولی ہدایت دی :-

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

(آل عمران : ۱۴۴)

"اور محمد (ﷺ) اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں' اور ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے ہیں' پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پا جائیں یا ایسا ہو کہ قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی الٹا پھرے گا وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' اور اللہ تعالیٰ شکر گزار لوگوں کو ضرور اچھا بدلہ عطا فرمائے گا"۔

میدانِ جنگ میں حضرت انسؓ کی زبان پر حق پرستی کا جو اصولی نعرہ جاری ہوا وحیِ الٰہی نے بعد میں اسی کی وضاحت کی جو اوپر مذکور ہے۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ پر وہی کیفیت طاری ہوئی۔ حضرت عثمان غنیؓ کو اس صدمہ سے چپ لگ گئی' حضرت عمرؓ اس غم انگیز حادثہ کے سبب اپنے حواس کھو بیٹھے اور تلوار سونت کر مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے اور یہ اعلان شروع کر دیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ وفات پا گئے' میں اس کا سر قلم کر دوں گا' آپ تو چالیس دن کے لئے اعتکاف میں چلے گئے ہیں۔ اس مایوسی اور بدحواسی کی فضا میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے منبرِ رسول پر کھڑے ہو کر یہی آیات تلاوت فرمائیں اور بے مثال ایمانی استقامت سے یہ اعلان فرمایا :

مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَاِنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ

"جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو وہ جان لے کہ آپ وفات پا گئے اور جو شخص خدا کی عبادت کرتا ہے تو وہ یقین کر لے کہ خدا ہمیشہ زندہ رہے گا' اس پر موت و زوال طاری نہیں ہو گا"۔

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ کے اس اعلان نے مایوسی کی فضا دور کر دی' ہر شخص کی زبان پر یہ آیت جاری تھی اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آیات ابھی ابھی نازل ہوئی ہیں۔

ان آیاتِ قرآنی کے اندر جو اصولی ہدایت پوشیدہ ہے اور جس ہدایت نے صحابہ کرامؓ کو اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثہ جدائی پر ثابت قدم رکھا' اس اصولی ہدایت کو دین کی اصلِ عظیم قرار دے کر جس شارحِ قرآن نے چند فقروں میں نمایاں کیا اور اس کی روح کو بے نقاب کیا وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ اگلی پچھلی اور موجودہ تفسیروں کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا آزاد کے اس استنباط و اجتہاد کی انفرادیت پر غور کیجئے کہ حق پرستی کے مقابلہ میں شخصیت پرستی کی تردید کو ایک اصلِ عظیم کے طور پر مولانا آزاد نے کس جرأت سے پیش کیا ہے اور کیسے نازک مقام پر پیش کیا؟

شخصیت پرستی کی تردید کا معاملہ اس وقت نازک ہو جاتا ہے جب شخصیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سامنے ہو' یہ شخصیت دین حق کی نمائندہ ہے' آپؐ کی حیات دین برحق کی عملی تصویر تھی' حق کا مظہر تھی۔ اس شخصیت کے مقابلہ میں دین حق کی اہمیت قائم رکھنا اور اصول کو شخصیت پر مقدم اور راجح قرار دے کر عاشقان رسولؐ کو مایوسی اور بددلی سے بچانا بڑا نازک معاملہ تھا۔ یہ جرأت و استقامت کا غیر معمولی مظاہرہ تھا' جو میدان جنگ میں حضرت انسؓ کی طرف سے ظاہر ہوا۔ پھر وحی الٰہی نے اسے واضح کیا اور پھر امت کے صدیق نے نہایت نازک موقع پر وحیِ الٰہی کی ترجمانی کا حق ادا کیا اور عقیدت مندانِ رسول اور عاشقانِ محمد ﷺ کی عقیدت کا احترام قائم رکھتے ہوئے امت کو حق پرستی پر قائم رکھا۔

آل عمران کی آیت (۱۴۴) پر مولانا آزاد کا تفصیلی نوٹ ملاحظہ ہو :

"(۷) اس اصلِ عظیم کی طرف اشارہ کہ بنائے کار اصول اور عقائد ہیں' نہ کہ شخصیت اور افراد۔ کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی

اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔ پس اگر کسی وجہ سے شخصیت ہم میں موجود نہ رہے یا درمیان سے ہٹ جائے تو ہم سچائی کی راہ سے کیوں منہ موڑ لیں یا ادائے فرض میں کیوں کوتاہی کریں؟ سچائی کی وجہ سے شخصیت قبول کی جاتی ہے' یہ بات نہیں ہے کہ شخصیت کی وجہ سے سچائی' سچائی ہو گئی ہو۔

جنگِ اُحد میں کسی مخالف نے یہ بات پکار دی تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مارے گئے' یہ سن کر بہت سے مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے' بعضوں نے کہا جب پیغمبر نہ رہے تو اب لڑنے سے کیا فائدہ؟ کچھ لوگ جو منافق تھے' انہوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر یہ نبی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ جنگ میں مارے جاتے۔ یہاں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر ہیں اور ظاہر ہے کہ انہیں بھی ایک دن دنیا سے جانا ہے جس طرح تمام پچھلے رسول دنیا سے گزر چکے ہیں۔ پھر اگر وہ دنیا سے گزر گئے تو تم حق پرستی کی راہ سے پھر جاؤ گے؟ اور تمہاری حق پرستی حق کے لئے نہیں بلکہ محض ایک خاص شخصیت کے لئے تھی؟ فرض کرو' جنگِ احد والی بات صحیح ہوتی تو پھر کیا ان کی موت کے ساتھ تمہاری خدا پرستی پر بھی موت طاری ہو جاتی؟ اگر تم حق کے لئے لڑ رہے تھے تو جس طرح وہ ان کی زندگی میں حق تھا اسی طرح ان کے بعد بھی حق ہے اور ہمیشہ حق رہے گا"۔

اس تفصیلی نوٹ کے علاوہ سورۂ یونس (۴۶) اور سورۃ الرعد (۴۰) میں دونوں ہم مفہوم آیتوں پر بھی مولانا نے اس اصل عظیم کی طرف اشارہ کیا۔ آیت سورۂ یونس حسب ذیل ہے:

﴿وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ۝﴾ (یونس: ۴۶)

"اور (اے نبی!) ہم نے ان (منکرین حق) سے (حق کی فتح اور باطل کی شکست کے) جو وعدے کئے ہیں ان میں سے بعض وعدے پورے کر کے آپ کو دکھا دیں یا ان وعدوں سے پہلے آپ کا وقت پورا کر دیں' لیکن بہرحال انہیں ہماری ہی طرف واپس آنا ہے' پھر اللہ تعالیٰ ہی ان کے اعمال پر گواہ ہے"۔

سورۃ الرعد کی آیت (۴۰) بھی اسی مفہوم کو بیان کر رہی ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے اس پر یہ مختصر تفسیری نوٹ تحریر فرمایا ہے :

"یعنی غلبہ اسلام کچھ حضرت کے روبرو ہوا اور باقی ان کے خلیفوں سے"۔

آیاتِ مذکورہ سے یہ اشارہ صاف طور پر سمجھ میں آ رہا ہے کہ اسلام کا غلبہ اور سیاسی فتحمندی حضور ﷺ کے عہد میں مکمل طور پر نہیں ہوئی۔ کچھ آپ کے عہد میں ہوئی اور باقی آپؐ کے جانشین خلفاء راشدین کے ہاتھوں سے ہوئی۔

مولانا آزادؒ نے شاہ صاحبؒ کے بیان کردہ اشارے کو نقل کرنے کے ساتھ ایک اشارہ اور بھی ظاہر کیا' جو مولانا آزاد کا نہایت معنی خیز اجتہاد کہا جا سکتا ہے۔ سورۂ یونس کی آیت ۴۶ پر لکھتے ہیں :

"آیت (۴۶) کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ حق کی فتح مندیوں اور منکروں کی نامرادیوں کی جو خبر دی گئی ہے کچھ ضروری نہیں کہ وہ سب تیری زندگی ہی میں پیش آ جائے' بعض باتیں تیری موجودگی میں ہو کر رہیں گی' بعض بعد کو واقع ہوں گی۔

پس منکروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس معاملہ کا دارومدار اس شخص کی زندگی پر ہے' یہ نہ رہے گا تو کچھ نہ ہو گا' تو زندہ رہے یا نہ رہے' لیکن احکام حق کو پورا ہو کر رہنا ہے' چنانچہ ایسا ہی ہوا"۔ (جلد دوم' ص ۱۵۹)

سورۃ الرعد کی آیت (۴۰) پر نوٹ لکھتے ہیں :

"یہ بات مختلف صورتوں میں بار بار کہی گئی ہے' معلوم ہوتا ہے اس سے مقصود صرف یہی نہیں تھا کہ مستقبل کی خبر دی جائے بلکہ یہ حقیقت بھی واضح کرنی تھی کہ کوئی شخصیت کتنی ہی اہم ہو لیکن پھر شخصیت ہے اور کاروبار حق کا معاملہ اس کی موجودگی و عدم موجودگی پر موقوف نہیں۔ جو کچھ ہونا چاہئے اور جو کچھ ہونے والا ہے' بہرحال ہو کر رہے گا' خواہ پیغمبر اپنی زندگی میں اس کا ظہور دیکھ لے یا نہ دیکھ لے۔

پھر غور کرو نتائج کا ظہور بھی ٹھیک ٹھیک اسی طرح ہوا' جن باتوں کی خبر دی گئی تھی ان کا بڑا حصہ تو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ظاہر ہو گیا یعنی انہوں نے دنیا چھوڑنے سے پہلے جزیرۂ عرب کو حلقہ بگوش اسلام پایا' البتہ بعض باتوں کا ظہور آپؐ کے بعد ہوا۔ مثلاً منافقوں کا استیصال' بیرونی فتوحات کا حصول اور خلافتِ

ارضی کے وعدہ کی تکمیل"۔ (جلد دوم' ص ۲۸۲)

مولانا آزاد نے خلافتِ ارضی کے جس وعدہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سورۃ النور (آیت ۵۵) میں بایں الفاظ مذکور ہے :

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ (۵۵)

"اللہ تعالیٰ نے ایمان اور نیک عمل لوگوں سے زمین کی خلافت کا وعدہ کیا ہے"۔

شاہ صاحبؒ اس پر لکھتے ہیں :

"یہ چاروں خلیفوں سے ہوا' پہلے خلیفوں سے اور زیادہ --- پھر جو کوئی اس نعمت کی ناشکری کرے ان کو بے حکم فرمایا اور جو کوئی ان کی خلافت سے منکر ہوا اس کا حال سمجھا گیا"۔ (حمائل صفحہ ۵۹۲)

یعنی ان حضرات کی خلافت کے منکرین کو قرآن کریم نے "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ" میں شمار کیا ہے --- پہلے خلفاء سے انبیاء سابقین کے جانشین مراد ہیں' یعنی نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین خلفاء کے ذریعہ زمین پر خلافتِ الٰہیہ کا قیام جس مکمل صورت میں ہوا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے صرف پہلے تین خلفاء کا ذکر کیا ہے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کو اس بشارت میں شامل نہیں کیا۔ (مختصر تفہیم ۵۶۵) مولانا مودودی مرحوم کی مشہور تصنیف "خلافت و ملوکیت" کے بعض ناقدین نے مولانا مرحوم کو شیعیت نوازی کا طعنہ دیا ہے' اس تشریح کے بعد کیا وہ اپنے طعنہ سے رجوع کریں گے؟

بقیہ : رمضان المبارک اور اس کی خصوصیات

دعا کی مقبولیت کے بیشتر اوقات اس ماہ میں رکھے گئے ہیں۔ رمضان' عبادت کا مقدس' پاکیزہ اور پر بہار موسم ہے اور دعا کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہے : الدعاء فح العبادہ (ترمذی' مشکوۃ ص ۱۹۴۔ ج ۱) یعنی دعا عبادت کا مغز اور گودا ہے۔ اسی بنا پر روزے دار کی دعا خصوصاً افطار کے وقت اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔

علّامہ اقبال اور جاگیرداری نظام

از ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

علامہ اقبال نہ صرف مفکرِ پاکستان تھے بلکہ اس کی ترقی کے لئے اسلام کے معاشرتی نظام کی برکات بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے اپنے کلام میں جابجا وقت کے بڑے ناسور سود' سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف نعرہ بلند کیا۔ اور اردو' فارسی اور نظم و نثر میں جگہ جگہ اس غیر انسانی اور ظالمانہ سسٹم کے خلاف اپنا احتجاج منظرِ عام پر لائے۔ موصوف محترم زمین کو ملکیت کے بجائے متاع قرار دیتے ہیں جس سے انسان کو ایک مختصر مدت کے لئے حق انتفاع بقدر محنت دیا گیا ہے۔ وہ بار بار "الارض للہ" کا نعرہ لگاتے ہیں اور جیسا کہ چوہدری مظفر حسین صاحب نے وضاحت کی ہے' ان کے نزدیک چونکہ زمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام نوع انسانی کے لئے آب و نان مہیا کرنے کا وسیلہ ہے' اس لئے وہ اس کی "امانت" کی حیثیت پر زور دیتے ہوئے کسی فرد (خواہ وہ مزارع ہو یا مالک)' کسی بادشاہ یا کسی حکومت کا زمین پر ایسا حق تسلیم کرنے کے روادار نہیں جو انصاف اور مفادِ عامہ کے خلاف ہو {۱} جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے۔ بانگِ درا کی ایک نظم ہے:

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ کرے جو زراعت' اسی کا کھیت
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے' وہ دھرتی کا مال ہے {۲}

اسی مضمون کو "بال جبریل" میں "الارض للہ" کے عنوان سے یوں بیان کرتے ہیں۔ دلائل کی کاٹ' لہجے کا جوش.....اور اظہار کی شدت لائق توجہ ہے :

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں {۳}

چنانچہ لگی لپٹی رکھے بغیر برملا انداز میں اقبال زمین کو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت قرار دیتے ہیں اور صرف عارضی مدت کے لئے بقدر محنت وضرورت اس سے فائدہ اٹھانے کے حق میں ہیں۔ "جاوید نامہ" میں کہتے ہیں :

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
وہ خدایا' نکتۂ از من پذیر
رزق و گور ازوے بگیر او را بگیر {۴}

"یعنی (خدا کے سوا) زمین کا کوئی مالک نہیں۔ یہ تو وہ قیمتی متاع یا امانت ہے جو اللہ نے انسانوں کو مفت مہیا کی ہے۔ چنانچہ جاگیردار یا زمیندار کے لئے میری نصیحت ہے کہ وہ اس سے صرف (بقدر ضرورت) رزق پیدا کرے اور قبر کے لئے جگہ حاصل کرے' جبکہ اس کا مالک بننے کی کوشش نہ کرے"۔

اسی نکتے کی مزید وضاحت جمال الدین افغانی کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں۔

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست
بندۂ مومن امیں' حق مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کَنَفسٍ وَاحِدَہ" {۵}

"زمین سے (بقدر ضرورت) رزق حاصل کرنا ہی جائز ہے کہ اس کا مالک صرف خدا ہے اور بندے کے پاس تو یہ محض امانت (متاع) ہے اور چونکہ اس کا مالک خدا کے سوا کوئی نہیں اور مرد مومن اس کا محض امانت دار ہے' اس لئے جب وہ اپنے حق سے تجاوز کرتے ہوئے اس کا مالک بننے کی کوشش کرے گا' تو گویا موت اور بربادی کا سامان کرے گا۔ بنی آدم ایک خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں اور زمین سب کے آب و نان کا مشترکہ دسترخوان ہے"۔

اقبال کے نزدیک مسئلہ ملکیت زمین اتنا اہم ہے کہ انہوں نے پہلو بدل بدل کر اس کا تذکرہ کیا ہے اور بار بار اپنے اس موقف پر زور دیا ہے کہ زمین کا مالک خدا کے سوا اور کوئی نہیں اور جب انسان اس متاع یا امانت کے مالک بنیں گے تو یہ دراصل ابلیس کی تقلید ہوگی اور اس سے شر اور فساد کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے مسئلے کا حل محض یہی ہے کہ حق دار کو حق واپس کیا جائے اور انسان زمین کو صرف ایک امانت سمجھ کر اس سے استفادہ کرے۔

اے کہ می گوئی متاع ما زِ ماست
مرد ناداں! ایں ہمہ مِلکِ خدا است
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو
چیست شرحِ آیۂ لَا تُفسِدُوا
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد
من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکارِ خود نبرد
اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد {۶}

مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس آئینِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جب خوفزدگی کا اظہار کرتا ہے تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ نظام۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں {۷}

زمین کے بارے میں علامہ مرحوم کے نظریات اتنے محکم ہیں کہ اس کا اظہار انہوں نے جابجا نثر میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ موصوف محترم کے مصاحب خاص سید نذیر نیازی اپنی گرانقدر تصنیف "اقبال کے حضور" میں مرحوم کی گفتگوؤں کے حوالے سے ان کے متذکرہ موقف پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وفات سے چند ماہ قبل ۴ جنوری ۱۹۳۸ء کو نیازی صاحب کے سوال کے جواب میں علامہ نے فرمایا :

"دراصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے فقہاء نے زمین کے مسئلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بہ تحقیق مطالعہ کیا جائے۔ پھر ماہرین فن موجودہ حالات کی رعایت سے اس مسئلے پر غور کریں۔ زمین کی بہرحال یہ حیثیت نہیں کہ ہم اس پر عام اشیائے استعمال کی طرح افراد کا حق ملکیت تسلیم کریں"۔

مزید ارشاد فرمایا :

"لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام کا قانون وراثت بڑا خوب ہے۔ اس کی غایت دولت کی تقسیم در تقسیم ہے تاکہ زراندوزی کی نوبت آئے نہ اجارہ داری کی' نہ جاگیریں ہوں' نہ زمیندار اور کاشتکار کا باہمی نزاع۔ یوں نظام سرمایہ داری پر بھی کڑی ضرب لگتی ہے۔ رہی زمین' سو زمین اللہ کا مال ہے"۔ {۸}

خواجہ عبدالرحیم کے نام ایک خط میں بھی علامہ نے اپنا یہی موقف بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"اسلام کے نزدیک زمین وغیرہ امانت ہے۔ ملکیت مطلقہ جس کو قدیم و جدید قوانین تسلیم کرتے ہیں میری ناقص رائے میں اسلام نہیں ہے"۔ {۹}

اس مسئلے کی مزید توضیح علامہ مرحوم کے مکتوب مورخہ ۱۱/ دسمبر ۱۹۳۴ء میں ملاحظہ ہو جو مولانا راغب احسن کے نام لکھا گیا۔ اس میں جاوید نامہ کے عنوان "ارض ملکِ

خداست" والے اشعار کا حوالہ بھی ہے جن میں سے چند اوپر نقل ہوئے ہیں۔ اس خط کی مدد سے مسئلہ ملکیت زمین کے بارے میں ایک مفصل مقالہ بلکہ کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ علامہ اپنے خط میں لکھتے ہیں :

"اس بحث میں جو کچھ میرے خیالات ہیں ان کا اظہار جاوید نامہ میں کر چکا ہوں۔ قرآن پاک میں تو ارض کے متعلق کئی دفعہ آیا ہے کہ الارضُ لِلّٰہ اور حضرت آدم سے بھی یہی کہا گیا کہ تمہارے لئے ارض مستقر اور متاع یعنی فائدے کی چیز ہے۔ اسلام کے نزدیک ملکیت صرف اللہ کی ہے۔ مسلمان صرف اس چیز کا امین ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔ میری رائے میں اگر کوئی مسلمان اپنی پرائیویٹ زمین وغیرہ کا غلط استعمال کرے تو حاکمیت اسلامیہ کا حق ہے کہ وہ اس سے باز پرس کرے۔ یہی وہ نکتہ ہے اسلام کا جس کو یورپ میں مسولینی نے خوب سمجھا ہے۔

غالباً امام محمد یا ابو یوسف سے خلفائے عباسیہ میں سے کسی نے فتویٰ زمین کی ملکیت کے متعلق طلب کیا تھا تو انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ زمین اس کی ملکیت ہے جو اس کو زندہ رکھ سکے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمین کا مالک امام کے نزدیک وہی ہے جو حقیقت میں اپنی محنت سے اسے کاشت کرتا ہے نہ وہ شخص کہ گھر میں بیٹھا بٹائی لیتا ہے۔ حضور رسالت مآبؐ نے تو حیوانوں پر بھی شفقت کی ہے اور حکم دیا ہے "المرعیٰ لِلّٰہ ورَسولِہ" یعنی چراگاہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ملکیت ہیں کسی شخص کی پرائیویٹ ملکیت نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض احادیث میں دو منزلہ مکان بنانے سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ غرضیکہ اس معاملے میں مفصل بحث اور ریسرچ کی ضرورت ہے۔ اس پر آج تک کسی نے نہیں لکھا۔ مسلمان علماء اپنی غفلت سے اسلامی عقائد پر بحث مباحثے کرتے رہے اور اسلام کے معاشرتی نظام کی طرف کسی نے (شاید سوائے شاہ ولی اللہؒ کے) توجہ نہیں کی۔ اب اس زمانے میں معاشرتی نظام اسلام کی تفصیلات کی ضرورت ہے کیونکہ لوگ موجودہ زمانے

کے اقتصادی سوالات کی وجہ سے عقائد مابعد الطبیعی میں دلچسپی نہیں لیتے۔ بحیثیت مذہب کے اسلام کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے معاشرتی نظام کی افضلیت زمانہ حال کے نظاموں پر ثابت کی جائے۔ یورپ اور اسلام کی رقابت ہمیشہ رہی ہے مگر اس سے پہلے اس کا انتہائی نقطہ حروب صلیبیہ تھا اب یورپ اور اسلام کی جنگ تلواروں کی نہیں بلکہ معاشرت کے نظاموں کی ہوگی۔ یعنی فسطائیت' بولشزم اور اسلام وغیرہ Plans پر معرکہ آرا ہوں گے۔ مسلمانوں میں تو اس وقت اس مطلب کے آدمی موجود نہیں' کیا عجب یورپ کے مفکر خود اس نظام کا انکشاف کرلیں۔ یہ امر مشکل بہت ہے' کیونکہ مذہب اسلام پر قرون اولی سے ہی مجوسیت اور یہودیت غالب آئی' یعنی اسلام کے اصل افکار کو یہودی اور مجوسی افکار نے عوام کی نگاہوں سے چھپالیا۔ میری ناقص رائے میں اسلام آج تک بے نقاب نہیں ہوا۔ افسوس کہ علالت کی وجہ سے آپ کو طویل خط نہیں لکھ سکتا' جو کچھ میں نے لکھا ہے محض اشارات ہیں' ان کی تفصیل اگر آپ سامنے ہوتے تو زبانی عرض کرتا۔ جاوید نامہ کے مختلف مقامات پر اس مسئلے کے مختلف پہلو آئے ہیں' اس کو شروع سے آخر تک پھر پڑھئے۔ آپ کی آگاہی کے لئے یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ قرآن نے تقسیم جائیداد کے متعلق جو قاعدہ دیا ہے اس کا اطلاق (میری ناقص رائے میں) زمین پر نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ صرف جائیداد منقولہ کے لئے ہے۔ مگر علماء کی رائے مختلف ہے اور مسلمانوں کی پریکٹس بھی اس بارے میں' جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' مختلف ہے۔"

اقبال نے مقننہ پنجاب کا رکن ہونے کے دور میں (۱۹۲۶-۱۹۲۹ء) اس ضمن میں بڑی زمینداریوں کے خلاف تقریریں کیں۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ نصف سرکاری زمین کاشتکاروں کو فروخت کی جائے اور قیمت اقساط میں وصول کی جائے۔ انہوں نے بڑے زمینداروں کا مالیہ بڑھانے اور معمولی اراضی رکھنے والوں کا لگان معاف کردینے

کا مطالبہ بھی کیا تھا۔

دراصل علامہ اقبال کا مدعا' بقول چودھری مظفر حسین' یہ تھا کہ جس طرح پانی' ہوا اور روشنی کے وسائل' جن پر پوری انسانیت کی بقاء کا انحصار ہے' کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے اسی طرح زمین بھی' خوراک پیدا کرنے کا ذریعہ ہونے کے اعتبار سے کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی {۱۰} اور یہ نظریہ اگرچہ جاگیرداری نظام کی موجودہ گھناگھمی میں بظاہر اجنبی دکھائی دیتا ہے' مگر اسلامی تعلیمات کی روح کے عین مطابق ہے اور اس سلسلے میں قرآن حکیم' احادیث رسول اور جید ائمہ اور علماء کی تحریروں سے مثالیں دی جا سکتی ہیں' مگر خوف طوالت سے صرف شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی یہ رائے اور قول فیصل نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں :

"خدا کی یہ ساری زمین سب انسانوں کے لئے ایک مسجد اور سرائے کی طرح وقف ہے۔ جس طرح ایک وقف میں سب مسافروں کو فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق ہوتا ہے' اسی طرح سب لوگ خدا کے اس وقف (یعنی زمین) سے فائدہ اٹھانے میں برابر کے شریک ہیں"۔ {۱۱}

چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ علماء' ماہرین قانون اور ماہرین زراعت باہم مل کر علامہ اقبال کے فرمودات کی روشنی میں کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس کے نتیجے میں جاگیرداری نظام کا مکمل خاتمہ ہو اور زمین سے سب انسان مشترک طور پر فائدہ اٹھا سکیں۔ ظلم اور استحصال کی وہ صورت ختم ہو جو جسد وطن میں ناسور سے آگے بڑھ کر سرطان بن گئی ہے۔ یہ حقیقت بڑی تکلیف دہ اور کرب انگیز ہے کہ پاکستان میں ہمہ نوع مسائل جاگیرداری نظام کی کوکھ سے برآمد ہوئے ہیں اور یہ نظام وطن عزیز میں سیاسی' اخلاقی' معاشی' روحانی اور تہذیبی المیوں کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے اور جب تک یہ قبیح اور انسانیت سوز سسٹم موجود ہے' ہم اس ہلاکت خیز گرداب سے کبھی نہیں نکل سکتے جس میں ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔

حوالہ جات

(۱) اقبال کے زرعی افکار..... ص ۱۳ (۲) بانگ درا..... ص ۲۹۰

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ

تحریر : عبدالرشید عراقی

مؤلفین صحاح ستہ میں امام محمد بن اسماعیل بخاری کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ آپ کو امام المحدثین اور امیر المومنین فی الحدیث کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے : محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بروزبہ۔{۱}

امام صاحب کے جد امجد مغیرہ نے اسلام قبول کیا اور امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے۔ اس کی نسبت سے جعفی مشہور ہوئے۔ اور امام بخاری بھی جعفی کے لقب سے مشہور ہوئے۔{۲}

پیدائش اور ابتدائی حالات

امام بخاری ۱۳/ شوال ۱۹۴ھ بعد نماز جمعہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں امام صاحب کی آنکھیں خراب ہو گئیں اور بصارت جاتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ان کے والد امام اسماعیل کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ امام صاحب کی والدہ بہت عابدہ اور صاحب کرامات تھیں۔ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا تو آپ فرما رہے تھے کہ تمہاری کثرتِ دعا سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیٹے کی آنکھیں درست کر دی ہیں۔ اسی خواب کی صبح سے امام صاحب کی آنکھیں درست ہو گئیں۔{۳}

تحصیل علم

امام بخاری کے والد کا انتقال امام صاحب کی صغر سنی میں ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت کا انتظام آپ کی والدہ نے کیا۔ ۱۶ سال کی عمر میں امام صاحب نے امام عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتابوں کو حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد آپ کی والدہ امام صاحب اور آپ کے بڑے بھائی احمد بن اسماعیل کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ چلی آئیں جہاں پر

امام صاحب نے دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کی والدہ اور بڑے بھائی بخارا واپس چلے گئے اور امام بخاری مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے روضۂ نبوی کے پاس خاندانی اتوں میں اپنی دو کتابیں قضایا الصحابہ والتابعین اور تاریخ الکبیر تصنیف کیں۔ {۴}

سماع حدیث کے لئے سفر

امام بخاری نے سماع حدیث کے لئے سفر کا آغاز ۲۱۰ھ میں کیا اور آپ نے شام' مصر' جزیرہ' حجاز مقدس' کوفہ' نیشاپور' بغداد' بصرہ' بلخ' زراہ اور رے کا سفر کیا اور کئی مقامات پر آپ کئی بار تشریف لے گئے۔ بصرہ چار دفعہ گئے۔ بغداد اس زمانے میں علم کا گہوارہ تھا۔ ابن کثیر کی روایت کے مطابق آپ ۸ مرتبہ بغداد گئے۔ اور جب بھی بغداد تشریف لے جاتے امام احمد بن حنبل ان کو بغداد کے قیام پر اصرار کرتے۔ {۵}

اساتذہ و شیوخ

امام بخاری کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کا اپنا بیان ہے :

کتبتُ علی الف ثمانین نفسًا لیس فیھم الا صاحب الحدیث {۶}

"میں نے ۱۰۸۰ آدمیوں سے حدیثیں لکھیں اور یہ سب کے سب محدث تھے"۔

لیکن امام بخاری نے سب سے زیادہ اکتساب فیض امام اسحاق بن راہویہ اور امام علی بن مدینی سے کیا۔ {۷}

تلامذہ

امام بخاری کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں سے آدمی آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ امام صاحب سے براہ راست ۹۰ ہزار آدمیوں نے الجامع الصحیح کو سنا۔ {۸} آپ کے تلامذہ میں ارکانِ صحاح ستہ میں سے امام مسلم بن حجاج' امام ابو عیسیٰ ترمذی اور امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب

نسائی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ امام ابو زرعہ' ابو حاتم' ابن خزیمہ' محمد بن نصر مروزی وغیرہ شامل ہیں{۹}

غیر معمولی قوت حافظہ

امام بخاری فطرتاً نہایت قوی الحافظہ تھے۔ فطرت کی اس فیاضی سے انہوں فن حدیث کی تحصیل میں بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ وہ جس کتاب پر نظر ڈالتے تھے وہ حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ ان کا حافظہ لاکھوں حدیثوں کا نشیمن تھا اور خود فرمایا کرتے تھے کہ

"مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں۔ اور جامع صحیح بخاری کو میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے"۔{۱۰}

امام صاحب کے غیر معمولی حافظہ کے بہت سے واقعات اربابِ سیر نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں۔ یہاں صرف آپ کے حافظہ کا ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے' جس کو حافظ ابن حجرؒ نے مقدمہ فتح الباری میں نقل کیا ہے۔

جب آپ بغداد تشریف لائے تو یہاں ان دنوں علم حدیث کا بہت چرچا تھا۔ وہاں کے علمائے کرام اور محدثین عظام نے ان کا امتحان لینے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ایک سو حدیث کے متون اور اسانید کو الٹ پھیر کر دس آدمیوں کے حوالہ کیا کہ ہر شخص ان میں سے ان دس احادیث کو امام صاحب کے سامنے پیش کرے۔ چنانچہ یہ سو احادیث امام صاحب کے سامنے پیش کی گئیں اور آپ نے ہر حدیث کے بارے میں فرمایا : لَاأَدْرِی (میں نہیں جانتا) جب تمام لوگ احادیث سنا چکے تو امام صاحب نے ہر حدیث کو اس کی اصل سند اور متن کے ساتھ ملحق کر کے ترتیب وار سنایا۔ لوگ یہ سن کر دنگ رہ گئے اور ان کو آپ کے علم و فضل کا لوہا ماننا پڑا۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ

تعجب اس پر نہیں کہ صحیح و غلط میں امتیاز کر دیا' کمال یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس ترتیب سے روایات کو غلط شکل میں پیش کیا تھا' اس کو بھی بیان کرایا{۱۱}

امام بخاری کا زہد و تقویٰ

امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی دولت بھی عطا فرمائی تھی۔ آپ کے والد نے کافی دولت چھوڑی تھی' جو آپ نے سب غرباء و مساکین میں تقسیم کر دی اور خود نانِ خشک اور آبِ خنک سے گزارا کیا۔ ایک دفعہ آپ سخت بیمار ہو گئے۔ آپ کا قارورہ اطباء کو دکھایا گیا تو انہوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سالن استعمال نہیں کرتے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ ۴۰ سال سے سالن استعمال کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ {۱۲}

امام صاحب کی نماز میں بہت خشوع و خضوع ہوتا تھا اور بھڑ کے کاٹنے کے باوجود نماز میں یکسوئی رہتی۔ مزاج میں بہت احتیاط تھی' غیبت سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ غیبت کرنا حرام ہے اس وقت سے کسی کی غیبت نہیں کی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

"مجھے توقع ہے کہ میرے اعمال نامہ میں ایک گناہ بالکل نہیں ہو گا اور وہ غیبت ہے اور اللہ تعالیٰ میرا اس بارے میں محاسبہ نہیں فرمائے گا۔" {۱۳}

امام بخاریؒ کے بارے میں ان کے شیوخ اور معاصرین کا اعتراف

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی مدح میں اگر متاخرین کے اقوال نقل کئے جائیں تو کاغذ اور روشنائی ختم ہو جائے۔ فذلک بحرٌ لا ساحلَ لہ۔ ع سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے۔ ان کے شیوخ و معاصرین سب ان کے علم و فضل' جلالتِ علمی اور زہد و وَرع کے معترف تھے۔ امام مسلم نے ایک دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فرمایا: "اشھد انہ لیس فی الدنیا مثلک" (میں گواہی دیتا ہوں کہ دنیا میں تیرے جیسا اور کوئی انسان پیدا نہیں ہوا)۔ اور امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ "آسمان کے نیچے امام بخاری سے بڑھ کر میں نے کسی کو عالمِ حدیث نہیں دیکھا۔" {۱۴}

امام بخاری کا مسلک

امام بخاری کے مسلک کے بارے میں علمائے کرام میں اختلاف ہے۔ کبار محدثین

کے بارے میں ہمیشہ یہی معاملہ رہا ہے کہ مختلف مسالک کے پیروکاروں نے انہیں اپنے اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ تقی الدین سبکی نے ان کو شافعی لکھا ہے اور محی السنہ نواب صدیق حسن خان نے بھی علامہ سبکی کی تائید کی ہے اور ان کو شافعی مسلک کا پیرو قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے کہ امام بخاری شافعی مسلک کے تھے۔ حافظ ابن قیم کی تحقیق کے مطابق امام بخاری حنبلی المذہب تھے۔ علامہ طاہر الجزائری کی تحقیق یہ ہے کہ امام بخاری مجتہد مطلق تھے اور مولانا سید انور شاہ کشمیری نے بھی علامہ طاہر الجزائری کی تحقیق سے اتفاق کیا ہے۔ {۱۵}

(جاری ہے)

حواشی

{۱} ابن حجر' تہذیب التہذیب' ج ۸' ص ۱۵۰
{۲} ابن حجر' مقدمہ فتح الباری' ص ۴۴۸
{۳} ابن السبکی' طبقات الشافعیہ الکبری' ج ۲' ص ۴
{۴} ابن حجر' مقدمہ فتح الباری' ص ۴۷۸
{۵} قسطلانی' ارشاد الساری (مقدمہ)' ص ۳۱
{۶} ابن حجر' مقدمہ فتح الباری' ص ۴۷۹
{۷} ابن حجر' تہذیب التہذیب' ج ۸' ص ۱۵۰
{۸} قسطلانی۔ مقدمہ ارشاد الساری' ص ۳۳
{۹} ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۲' ص ۱۳۴
{۱۰} قسطلانی۔ مقدمہ ارشاد الساری' ص ۲۹
{۱۱} ابن حجر۔ مقدمہ فتح الباری' ص ۵۷۳
{۱۲} عبد السلام مبارکپوری' سیرۃ البخاری' ص ۷۷
{۱۳} ابن حجر۔ مقدمہ فتح الباری' ص ۵۷۴
{۱۴} ابن حجر' تہذیب التہذیب' ج ۱' ص ۳۷۰

{۱۵} ابن السبکی' طبقات الشافعیہ الکبری' ج ۳' ص ۴۔ صدیق حسن خان' ابجد العلوم' ص ۸۱۰۔ ابن القیم' اعلام الموقعین' ج ۱' ص ۲۲۶۔ طاہر الجزائری' توجیہ النظر' ص ۱۸۵۔ انور شاہ کشمیری' فیض الباری' ج ۱' ص ۵۸

بقیہ : علامہ اقبال اور جاگیرداری نظام

---

(۳) بال جبریل..... ص ۴۱۱
(۴) جاوید نامہ..... ص ۶۶۱
(۵) ایضاً..... ص ۶۶۸
(۶) ایضاً..... ص ۶۹۷
(۷) ارمغان حجاز..... ص ۶۵۵
(۸) اقبال کے حضور..... ص ۲۸' ۲۹
(۹) انوار اقبال..... ص ۲۴۵
(۱۰) اقبال کے زرعی افکار..... ص ۵۰' ۵۱
(۱۱) بحوالہ ایضاً..... ص ۱۹

بے سمجھے قرآن کی تلاوت؟

تحریر : فضیلۃ الشیخ علی طنطاوی ' ترجمہ : اِمِّ بلال

یہ سوال ایک طالبہ کی طرف سے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ رمضان میں قرآن شریف پڑھتی ہے مگر اس کے معانی نہیں سمجھتی' تو کیا اس پر ثواب ملے گا یا نہیں؟

سب سے پہلے تو اس سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طالبہ دین دار ہے۔ اللہ اسے برکت دے' وہ چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ معلوم کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں اس میں ثواب ہے' خواہ آپ اس کے معانی نہ سمجھتی ہوں۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن صرف بلا سمجھے پڑھنے کے لئے نازل ہوا ہے؟ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی طالب علم نے کتاب خریدی۔ امتحان کے دنوں میں اسے پڑھا' لیکن جب اس کتاب کے موضوع کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ کچھ بھی نہ بتا سکا تو کیا اسے پڑھنا کہیں گے؟

یا یہ روز مرہ کا اخبار لے لیں۔ آپ اسے خرید کر اول سے آخر تک اشتہارات سمیت پڑھ ڈالیں۔ اس میں جلی عنوان ہوں' بڑی بڑی سرخیاں کہ افغانستان میں یہ ہو گیا' لبنان میں وہ ہوا' بلقان کی یہ خبر ہے۔ غرض تمام اخبار پڑھنے کے بعد کوئی آپ سے پوچھے "بھائی اخبار میں کیا کیا خبریں ہیں' کچھ ہمیں بھی بتاؤ"۔ تو آپ یہ جواب دیں کہ ہاں پڑھا تو ہے مگر خبریں معلوم نہیں تو کیا آپ کا یہ پڑھنا' پڑھنا شمار ہو گا؟ یا میں ایک غیر زبان کی کتاب خریدوں اور پڑھنے کے لحاظ سے اس کی بالکل صحیح ریڈنگ کر جاؤں کہ اہل زبان سنے تو کہے بڑی عمدہ ریڈنگ کی ہے مگر مجھے کتاب سمجھ میں خاک بھی نہ آئی تو کیا کہا جائے گا کہ اس کتاب کے موضوع سے میں واقف ہوں۔

میں کسی پر تنقید نہیں کرتا' لیکن قبل اس کے کہ آج کل کے سبھی نہیں تو اکثر قاریوں کے بارے میں کچھ کہوں جو قراءت کرتے ہیں یا ریڈیو پر پڑھتے ہیں' میں قاری کی حقیقت

بیان کرنا چاہوں گا۔ قاری کسے کہتے ہیں؟ اسلام کے صدرِ اول میں قاری کا مطلب تھا قرآن کو بالکل صحیح پڑھنے اور اس کے احکام کو پوری طرح جاننے والا شخص۔ آپ اسلامی تاریخ مغازی دیکھیں۔ جنگ یمامہ جو مرتدین کے ساتھ ہوئی تھی' اس میں ستر حفاظ شہید ہوئے۔ میں کسی کی تخصیص نہیں کرتا بلکہ عمومی مشاہدہ کے تحت کہہ رہا ہوں کہ کیا وہ آج کل کے قراء کی طرح تھے---؟ جو ریڈیو ٹی وی پر گانوں کے سے انداز میں تانیں نکال کر پڑھتے ہیں کہ واللہ اگر کوئی دور سے سنے تو پہچان نہ پائے کہ قرآن پڑھا جا رہا ہے یا گانا گایا جا رہا ہے۔

قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنے کی ترغیب آئی ہے' لیکن ایسی خوش الحانی جس میں بے ساختگی اور روانی ہو۔ موسیقی کی طرز اور اصولوں پر تلاوت نہیں ہونی چاہئے۔ آج آپ قاریوں کو سنیں کہ جہاں آیت ختم ہوئی سامعین کی طرف سے اللہ کی صدائیں بلند ہو جاتی ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا تم نے کسی مغنّی کو گاتے سنا ہے؟ کیا تم نے اس کلام سے کوئی نصیحت پکڑی یا محض لطف اندوز ہوئے---؟

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے' جس کا میں خود شاہد ہوں۔ میرے ایک شاگرد نے جو ریڈیو دمشق کا ڈائریکٹر تھا' رمضان کے دنوں میں دمشق کی جامع اموی میں محفل قراءت منعقد کرانے کا ارادہ کیا۔ سب سے پہلے تو قاریوں میں اختلاف ہو گیا کہ سورۃ مریم کون پڑھے گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس میں آیتوں کے آخر میں یائے مشددہ آتی ہے۔ گویا قراءت کا انتخاب لحن کے مطابق کرتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ کلام فلاں کا ہے' آواز فلاں کی اور موسیقی فلاں نے ترتیب دی۔ پھر ان قراء میں سے ایک نے سورۃ الحاقہ یہ آیات پڑھیں' جبکہ یہ آیات وہ ہیں جنہیں سن کر واللہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور دل کانپ اٹھے۔ شدید وعید کی آیتیں ہیں۔

﴿ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝ ﴾

"(حکم ہو گا) پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اسے ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔

ڈرا دینے والی یہ آیات اس نے خوب مقفیٰ و مسجّع بنا کے پڑھیں اور لوگ اس طرح وجد میں آئے جیسے رقص کی مناسبت سے کوئی نغمہ سن لیا ہو۔ کیا قرآن پڑھنے اور سننے کا مقصد یہی ہونا چاہئے؟ ایک دفعہ ہمارے شیخ مفتی شام' شیخ ابو جسر عابدینؒ نے جو طبیب بھی تھے' اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ تو ایسے ہے جیسے ایک ملزم جو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوا ہو اور قاضی نے اس کے بارے میں حکم سنا دیا ہو کہ اسے موت کی سزا دی جاتی ہے اور وہ سن کر کہے اللہ! قاضی کی آواز کیا سریلی ہے اور کلام کیسا مطربانہ ہے۔ تو یہی حال اکثر لوگوں کا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ قرآن خوش الحانی سے مت پڑھو یا بغیر سمجھے کبھی مت پڑھو۔ میرے اس کہنے کا غلط مطلب نہ لو' قرآن بلا سمجھے پڑھنا بھی ثواب ہے۔ اس کے ہر ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں لیکن کیا یہی مقصود ہے؟ کیا قرآن صرف اس لئے نازل ہوا ہے کہ ہم ختم پر ختم کئے جائیں' بغیر یہ دیکھے کہ ہماری سمجھ میں بھی کچھ آیا---؟ آپ حرم میں چلے جائیں۔ بیسیوں آدمی مصحف کھولے پڑھتے نظر آئیں گے' لیکن اگر آپ ان میں سے ایک سے کسی آیت کا مطلب پوچھ لیں تو معنی نہ بتلا سکیں گے۔ میں نے ایک مرتبہ ایک تلاوت کرنے والے سے اس کا مطلب پوچھا۔ وہ لعان کی آیت پڑھ رہا تھا تو میرا سوال سن کر متعجب ہو گیا اور میری طرف کھلی آنکھ سے محض دیکھتا ہی رہ گیا گویا کہہ رہا ہو کیا صرف پڑھ لینا ہی کافی نہیں---؟ تو میرے کہنے کا مطلب ہے قرآن پڑھو اور ضرور پڑھو' خوش الحانی سے پڑھو' مگر اسے سمجھو ضرور۔ یہ میں کوئی اپنی طرف سے نہیں کہتا' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝﴾

"کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟"

تو اے بھائیو! اپنے دلوں پر لگے ہوئے تالے توڑ ڈالو تاکہ وہ قرآن سمجھنے کے لئے کھل جائیں۔ قرآن ایک دستور ہے' قرآن ایک ضابطہ حیات ہے۔ قرآن امر و نہی کا مجموعہ ہے۔ اگر ایک قاضی قانونی مسودہ کو خوبصورت' خوش رنگ اور جلی حروف میں لکھوا کر دیوار پر لٹکا دے' مگر خود اس کے خلاف کرے تو اسے صلہ دیا جائے گا یا سزا دی

جائے گی؟ فوج کے کسی کمانڈر کو حکم ملا کہ کل ۸ بجے دشمن پر حملہ کرنا ہے' اس نے اس حکم کو سر آنکھوں پر رکھا' اس کی تعظیم کی' اس کے احترام کے لئے کھڑا ہوا' مگر اگلے روز ۸ بجے تک پڑا سوتا رہا۔ تو کیا اسے انعام ملے گا یا اس کا کورٹ مارشل ہو گا--؟ تو ہمارے رب نے مومنین کی صفت بیان کی ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا جاتا ہے تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ ان کے دل نرم ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان کا طرب اور خوشی بڑھ جاتے ہیں۔

اگر کمرے میں دو بٹن لگے ہوئے ہیں' ایک سے پنکھا چلتا ہے' دوسرے سے بلب روشن ہوتا ہے اور یہ بٹن بہت نزدیک لگے ہوں۔ اگر آپ سے غلطی ہو جائے تو مطلوبہ بٹن کی بجائے دوسرا بٹن دبا دیں جس سے پنکھے کی بجائے بلب یا اس کے برعکس بلب روشن ہونے لگے تو یہی حال دل کا ہے۔ اس میں بھی ایک بٹن خشوع کا ہے' دوسرا طرب و خوشی کا۔ تو وہ لوگ یہاں غلطی کرتے ہیں جو قرآن سن کر طرب میں آجاتے ہیں۔ خشوع والے بٹن پر ہاتھ رکھنے کی بجائے طرب والے بٹن پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔

تو بھائیو! یہاں خیال رکھو۔ قرآن پڑھو بھی اور اس کے سمجھنے کا اہتمام بھی کرو۔ OO

---

۶۸ ایمان افروز واقعات پر مشتمل قاضی عبید اللہ حلیم فضلی کی تالیف

توبہ

جو پیر طریقت محترم قاضی محمد حمید فضلی مدظلہ العالی کے حکم پر مرتب کی گئی

خود پڑھئے اور احباب کو تحفہ میں دیجئے

سفید کاغذ' کمپیوٹر کتابت' عمدہ طباعت' مضبوط جلد' قیمت صرف -/۱۰۰ روپے

شائع کردہ: ادارہ فیوضات مجددیہ خانقاہ فضلیہ' شیر گڑھ' تحصیل و ضلع مانسہرہ

نوٹ: یہ کتاب مکتبہ انجمن ۳۶-کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے

سُورۃ البقرۃ

آیات ۷۸-۷۹

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ 'الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبرا کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۴۹ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ○

۲:۴۹:۱ اللغـــة

۲:۴۹:۱(۱) وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ ابتدائی "ومنھم" "وَ" (اور) + "من" (میں سے) + "ھُمْ" (ان)

ہے اور یوں اس کا ترجمہ ہوا "اور ان میں سے" (ہیں یا تھے) جس کا بامحاورہ ترجمہ "ان میں سے کچھ/ بعض/ بہت (ہیں)" کی صورت میں کیا گیا۔ اور یہ "کچھ/بعض/بہت" اگلے لفظ "اُمِّیُّون" کے نکرہ ہونے کی وجہ سے لگانے پڑے ہیں۔ بیشتر مترجمین نے "منھم" کا ترجمہ "ان میں" کے ساتھ کیا ہے جو بلحاظ محاورہ درست ہے مگر بظاہر "فیھم" کا ترجمہ لگتا ہے [اُمِّیُّوْنَ] یہ لفظ "اُمِّیّ" کی جمع مذکر سالم ہے۔ اور "اُمِّیٌّ" کا مادہ "ا م م" اور وزن "فُعْلِیٌّ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد باب نصر سے "اَمَّ یَؤُمُّ" مختلف مصادر کے ساتھ مختلف معنی دیتا ہے

(۱) اَمَّ یَؤُمُّ اُمُوْمَۃً کے معنی ہیں "ماں بننا" کہتے ہیں "اُمَّتِ المرأۃُ" (عورت ماں بن گئی)۔ اور اسی سے لفظ "اُمٌّ" ہے جس کے بنیادی معنی "ماں" ہیں۔ دیگر معانی و استعمال آگے حسبِ موقع آئیں گے۔

(۲) اَمَّ یَؤُمُّ اَمًّا کے معنی ہیں: "کسی چیز کا قصد کرنا" مثلاً کہیں گے: "اَمَّ فلانٌ اَمْرًا" (فلاں نے ایک کام کا قصد کیا) اور اسی سے لفظ "اُمَّۃٌ" ہے یعنی وہ جماعت یا لوگ جو ایک مشترکہ قصد ارادہ اور واحد نصب العین رکھتے ہوں۔ اس لفظ (اُمَّۃ) کے بعض دوسرے معنی بھی ہیں جو حسبِ موقع بیان ہوں گے۔

(۳) اَمَّ یَؤُمُّ اِمَامَۃً کے معنی ہیں "لوگوں کے آگے چلنا اور ان کا لیڈر بننا" کہتے ہیں "اَمَّ القومَ" (اس نے لوگوں کی (نماز میں) امامت کی یا وہ لوگوں کا امام بنا)۔ عربی میں لفظ "امام" کے بھی متعدد معانی ہیں یہ بھی حسبِ موقع سامنے آئیں گے۔ قرآن کریم میں ان (تینوں) افعال سے کوئی صیغۂ فعل تو کہیں استعمال نہیں ہوا البتہ ان سے مشتق اور ماخوذ کلمات (اُم۔ امۃ۔ اَمَّ۔ اَمام۔ اِمام وغیرہ) مختلف صورتوں (واحد جمع مفرد مرکب) میں بکثرت وارد ہوئے ہیں۔ جن پر اپنی اپنی جگہ بات ہو گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

● لفظ "اُمِّیٌّ" (جس کی جمع "اُمِّیُّوْن" اس وقت زیر مطالعہ ہے) اسم نسبت ہے جس کی نسبت "اُمّ" سے بھی ہو سکتی ہے اور "اُمَّۃ" سے بھی۔ (جیسے "مَکۃ" سے "مَکِّیٌّ" بنتا ہے)۔ اس لفظ (امّی) کے بنیادی معنی "ناخواندہ یا ان پڑھ" ہیں یعنی جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو (ضروری نہیں کہ وہ جاہل یا نادان ہو)۔ گویا وہ بلحاظ خواندگی ویسا ہی ہو جیسا اسے ماں نے جنا تھا یا "ماں کے پاس ہی رہا کسی استاد کے پاس مدرسے وغیرہ میں نہ گیا"۔

● یہ لفظ (امّی) قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے طور پر دو جگہ (الاعراف: ۱۵۷، ۱۵۸) آیا ہے۔ اور "اُمِّیّ" ہونا آپؐ کی فضیلت اور آپ کا معجزہ اور دلیلِ صداقت ہے۔

ظہور اسلام سے پہلے اہل عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے عربوں کو "اُمّۃ اُمِّیّۃ" (ناخواندہ امت) کہا جاتا تھا اور ایک موقع پر آپؐ نے خود بھی فرمایا "نحن اُمّۃ اُمِّیّۃٌ" (ہم ناخواندہ امت ہیں)۔ اس کے علاوہ آپؐ کا "اُمّی" ہونا "ام القریٰ" (مکہ مکرمہ) سے نسبت رکھنے والا" کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے اور "امۃ اُمِّیّۃ" کی نسبت رکھنے والا" کی مناسبت سے بھی۔

● یہودی اپنے سوا باقی سب لوگوں کو "اُمّیّون" (اُمّی لوگ) کہتے تھے (آل عمران: ۷۵) اس طرح لفظ "اُمّیّون" (بصورت جمع) کہیں "ناخواندہ اور اَن پڑھ لوگوں" کے بنیادی معنی میں استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ اس سے مراد غیر اہل کتاب (Gentiles) بھی لیے جا سکتے ہیں۔

● زیر مطالعہ مقام پر لفظ "اُمّیّون" بظاہر اپنے بنیادی معنی (ان پڑھ لوگ) میں استعمال ہوا ہے کیونکہ بلحاظ سیاق عبارت اہل کتاب (یہودیوں) کے اُمّیون (ان پڑھوں) کا ذکر ہے۔ اور اسی لیے بیشتر مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ ان پڑھے/بے پڑھے/بن پڑھے/ناخواندہ اور ان پڑھ سے کیا ہے۔

[لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ] یہ ایک جملہ ہے جس کا پہلا حصہ "لا یعلمون" مادہ "ع ل م" سے بروزن "لَا یَفْعَلُوْنَ" فعل مضارع منفی (بلا) ہے جس کے باب معنی (عِلم یعلَم - جاننا) وغیرہ کی وضاحت البقرۃ: ۱۳ [۲:۱۰:۱(۳)] میں کی جا چکی ہے۔ دوسرا لفظ "الکتاب" (مادہ "ک ت ب" سے بروزن "فِعَال") ہے ان کے معنی وغیرہ [۲:۱:۲(۲)] میں بیان ہوئے تھے۔ لفظ "کتاب" اردو میں مستعمل ہے۔ اس لیے اس عبارت (لا یعلمون الکتاب) کا ترجمہ "نہیں جانتے کتاب کو" "کتاب کو نہیں جانتے، خبر نہیں رکھتے کتاب کی" اور "وہ کتاب سے واقف ہی نہیں" کی صورت میں کیا گیا ہے سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ البتہ بعض نے "الکتاب" کے لام تعریف کی وجہ سے "خاص کتاب" کا مفہوم لے کر ترجمہ "کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں رکھتے" یا "اللہ کی کتاب کو نہیں جانتے" کے ساتھ کیا ہے جو تفسیری ترجمہ ہے۔ اس "لا یعلمون" کا ایک اور مفہوم حصہ الاعراب میں بیان ہوگا۔

[۲:۴۹:۱(۲)] [اِلَّآ اَمَانِیَّ] میں "اِلّا" تو حرف استثناء ہے جس کا ترجمہ "مگر/سوائے/لیکن/بغیر" سے کیا جا سکتا ہے۔

لفظ [اَمَانِیَّ] غیر منصرف جمع مکسر ہے (جو عبارت میں منصوب آیا ہے) اس کا واحد "اُمْنِیَّۃٌ" ہے جس کا مادہ "م ن ی" اور وزن اصلی اس کا "اُفْعُوْلَۃٌ" ہے یعنی یہ دراصل "اُمْنُوْیَۃٌ" تھا۔ پھر "و" کو بھی "ی" میں بدل کر دونوں "یاء" مدغم کر دی جاتی ہیں اور پھر "ی" سے ماقبل ضمہ (ـُـ)

کو ثقیل سمجھتے ہوئے کسرہ (ــِ) میں بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے (جیسے مَبْیُوع سے مَبِیع اور مَرْمُوی سے مَرْمِیّ بنتا ہے) یوں یہ لفظ "اُمنِیّة" بنتا ہے۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "مَنَی یَمْنِیْ مَنْیًا" (ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں "کسی چیز کا اندازہ لگانا" اور اس سے اس میں "آزمانا، آزمائش میں ڈالنا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں جس کو آزمایا جائے وہ تو مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور جس چیز سے آزمایا جائے اس پر باء (ب) کا صلہ لگتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "مناہُ اللّٰہُ بِحُبِّھا" (اللہ نے اس (مرد) کو اس (عورت) کی محبت میں مبتلا کر دیا یا اس کے ذریعے آزمائش میں ڈالا)۔ ویسے ان (آزمانا اور امتحان لینا والے) معنی کے لیے یہ فعل واوی مادہ سے "منا یَمْنُو مَنْوًا" بھی استعمال ہوتا ہے مگر لفظ "اُمْنِیّہ" صرف یائی مادہ (م ن ی) سے آتا ہے۔ یہ فعل بعض صلات کے ساتھ اور صلہ کے بغیر بعض دیگر معانی کے لیے بھی آتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے کوئی صیغۂ فعل کسی معنی کے لیے بھی استعمال نہیں ہوا۔ البتہ مزید فیہ کے ابواب تفعیل، اِفعال اور تفعّل سے مختلف صیغے چودہ جگہ آئے ہیں اور مختلف مشتق و ماخوذ کلمات (امنیّة، امانیّ، مَنِیّ، مناة وغیرہ) دس کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔

● "اُمنِیّةٌ" (جس کی جمع "اَمَانِیّ" اس وقت زیر مطالعہ ہے) کے بنیادی معنی ہیں: "کسی چیز کی آرزو کرنے سے اس چیز کے بارے میں دل میں آنے والا تصور یا اندازہ" یعنی جس چیز کے بارے میں دل میں اندازے لگائے جائیں۔ اس سے لفظ میں "مرکز آرزو، خیالی اندازہ، دل میں باندھے ہوتے اندازے" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے چاہے وہ اندازہ (اور آرزو) حقیقت پر مبنی ہو یا اٹکل پر۔ بلکہ اکثر یہ لفظ "اٹکل پچو اندازہ اور خیالی پلاؤ" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور یوں اس میں "کذب" اور "جھوٹ" کے معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی جھوٹی آرزو۔ لفظ "امنیة" (واحد) قرآن کریم میں ایک جگہ (الحج: ۵۲) اور "امانی" (بصورت جمع اور مفرد مرکب معرفہ نکرہ) کل پانچ جگہ آیا ہے۔ اور اسی لفظ (امنیة) کا ایک معنی "بلے فہم تلاوت" بھی مراد لیا گیا ہے کیونکہ بقول راغب "بے معرفت تلاوت" بھی تخمین و ظن (اٹکل یا اندازہ) ہی ہوتی ہے۔

● اس طرح یہاں "امانیّ" کا ترجمہ اکثر نے تو "آرزوئیں، جھوٹی آرزوؤں، بلاسند دل خوش کن باتیں، باندھی ہوئی آرزوئیں، اور خیالات باطل" کی صورت میں کیا ہے اور بعض نے دوسرے معنی کو سامنے رکھتے ہوئے "زبانی پڑھ لینا" اور "بڑبڑا لینا" سے ترجمہ کیا ہے۔ جب کہ بعض نے اس کا ترجمہ "من گھڑت باتیں" کیا ہے جو "امانی" سے زیادہ "مفتریات" (افترا کردہ چیزیں) کا ترجمہ معلوم

ہوتا ہے۔

اس عبارت "لا یعلمون الکتاب الا امانی" کا ایک اور مفہوم حصہ "الاعراب" میں "امانی" کی نصب کے سلسلے میں بیان ہوگا۔

[وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ] یہ "وَ" (بمعنی اور) + اِنْ (نافیہ بمعنی "نہیں") + "ھُمْ" (ضمیر غائب بمعنی "وہ سب") + "اِلَّا" (بمعنی مگر/سوائے) "یظنون" (جس کے ترجمہ پر ابھی بات ہوگی) کا مرکب جملہ ہے "یظنون" (کا مادہ "ظ ن ن" اور وزن "یَفْعُلُوْنَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب وغیرہ اور خود اسی صیغہ کے معانی کی البقرہ: ۴۶ [۲:۳۰:۱(۴)] میں وضاحت ہو چکی ہے۔

● زیر مطالعہ عبارت میں "ظن" صرف "گمان اور جاہلانہ خیال" کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے پہلے ("لا یعلمون" میں) علم کی نفی کی گئی ہے۔ اس طرح اس عبارت (ان ھم الا یظنون) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "نہیں وہ مگر گمان کرتے ہیں" بیشتر مترجمین نے بامحاورہ بنانے کے لیے "ان" (نہیں) اور "اِلَّا" (مگر) کا مجموعی ترجمہ یا مفہوم "محض، فقط، صرف، نرے اور ہی" کے ذریعے ظاہر کیا ہے یعنی "یہ لوگ اور کچھ نہیں صرف خیالات پکا لیتے ہیں/ فقط خیالی تکے چلاتے ہیں/ صرف ظن سے کام لیتے ہیں/ محض تخیلات میں پڑے رہتے ہیں/ نرے گمان میں ہیں/ گمان ہی گمان رکھتے ہیں/ ان کا خیال ہی خیال ہے" کی صورت میں تراجم کیے گئے ہیں۔ اصل مفہوم ایک ہی ہے۔ عبارت کو زوردار بنانے کے لیے مختلف محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔

۲:۴۹:۱(۳) [فَوَیل للذین ۔۔۔]

ابتدائی "فاء" (ف) بمعنی "پس/سو/تو/پھر" ہے دیکھئے [۲:۶:۱(۱)] [وَیْلٌ] کا مادہ "و ی ل" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد استعمال ہی نہیں ہوتا۔ مزید فیہ کے "تفعیل، تفعل اور تفاعل" سے فعل بمعنی "کسی کو بربادی کی بددعا دینا" آتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کوئی صیغہ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس مادہ سے صرف یہی کلمہ "ویل" مختلف طریقوں پر قرآن کریم میں چالیس مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

● لفظ "وَیْل" کے معنی "تباہی، بربادی، شر، عذاب، خرابی، ذلت، رسوائی، ہلاکت اور بدبختی" ہیں۔ یہ بددعا یا اظہار افسوس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کا اردو ترجمہ "بڑی خرابی ہے اور "وائے افسوس ہے" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور بعض مقامات پر مندرجہ بالا دوسرے معانی کے ساتھ بھی ترجمہ کیا جاتا ہے جیسا کہ آگے آئیں گے۔

● "ویل" کا استعمال کئی طرح ہوتا ہے۔

① مفرد بطور مبتدا، عموماً نکرہ آتا ہے (نکرہ بددعا میں جائز ہے) مثلاً کہتے ہیں "وَیلٌ لفلانٍ" (فلاں کے لیے خرابی ہے/ ہو) یا یوں سمجھئے کہ جار مجرور خبر مقدم کے بعد مبتدا نکرہ (مؤخر) تھا مگر ترتیب الٹ دی گئی ہے یعنی "لفلانٍ ویلٌ" کو "ویل لفلان" کہہ دیتے ہیں۔ اس استعمال میں یہ مرفوع ہی آتا ہے۔ اس (مفرد مرفوع) استعمال کے ساتھ یہ لفظ قرآن کریم میں ۲۷ جگہ آیا ہے۔ اور ہر جگہ نکرہ ہی آیا ہے، صرف ایک جگہ (الانبیاء: ۱۸) یہ لفظ معرف بالام "الویلُ" استعمال ہوا ہے۔ یہ عموماً لام الجر (ل) کے ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے کبھی اس کے ساتھ "ب" بھی لاتے ہیں یعنی کہتے ہیں "ویل لفلان وبفلانٍ" تاہم قرآن کریم میں اس (مبتدا والے) استعمال میں یہ ہر جگہ لام الجر (لِ) کے ساتھ ہی آیا ہے۔

② کبھی مفرد مگر منصوب استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں: "ویلاً لِفلان"۔ اس صورت میں اس سے پہلے ایک فعل محذوف سمجھا جاتا ہے مثلاً "اَدعُو ویلاً لہٗ" یا "الزم اللہُ ویلاً لہ" (میں اس کے لیے تباہی کو بلاتا ہوں یا اللہ اس کے لیے بربادی لازم کرے) یعنی نصب اس محذوف فعل کے مفعول بہ ہونے کے اعتبار سے آتی ہے۔ اگر اس مادہ سے اپنا فعل استعمال ہوتا (جو کہ ہے ہی نہیں) تو "ویلاً" کو مفعول مطلق سمجھ سکتے تھے۔ اس لفظ کا یہ (مفرد منصوب والا) استعمال قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔

③ کبھی یہ مرکب (مضاف ہوکر) منصوب آتا ہے (اس صورت میں لام الجر کی ضرورت نہیں رہتی) جیسے "وَیلَکَ آمِنْ" (الاحقاف: ۱۷) میں ہے یعنی "تیرا ستیاناس ایمان لے آ"۔ اس صورت میں بھی اس سے پہلے ایک فعل محذوف سمجھا جاتا ہے۔ یہ استعمال (مرکب منصوب والا) قرآن کریم میں تین جگہ آیا ہے۔

④ کبھی یہ حرف ندا کے ساتھ منادیٰ مضاف (لہٰذا منصوب) استعمال ہوتا ہے جیسے "یَا وَیلَنَا" (اے ہماری خرابی) میں ہے۔ یہ استعمال بلکہ یہی ترکیب (یاوَیلنا) قرآن کریم میں چھ جگہ آیا ہے۔

⑤ کبھی یہ لفظ "ویل" کی بجائے "ویلۃ" استعمال ہوتا ہے کتب لغت میں "ویلۃ" کے معنی "فضیحت اور رسوائی" بتائے گئے ہیں۔ اس صورت میں بھی یہ (ویلۃ) حرف ندا کے بعد منادیٰ منصوب ہوکر ہی استعمال ہوتا ہے جیسے "یاویلتنا" (اے ہماری رسوائی) میں ہے یہ استعمال بلکہ یہی ترکیب (یاویلتنا) قرآن مجید میں صرف ایک جگہ (الکہف: ۴۹) آیا ہے۔ البتہ "یاویلتیٰ" (جو "یاویلتنا"

کی دوسری شکل ہے) کی ترکیب بھی قرآن کریم میں تین جگہ وارد ہوئی ہے۔ ان تمام استعمالات پر مزید بات اپنے اپنے موقع پر ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

● یہاں "ویل" کے بعد "للذین" ہے جو دراصل "لام الجر (ل) + الذین" ہے لام الجر کے بعد لام تعریف آئے تو املاء میں "الف" ساقط ہو جاتا ہے اور دونوں لام ملا کر لکھے جاتے ہیں" للذین" کا ترجمہ ہے" واسطے ان کے جو" جس کو" ان کے لیے جو' ان کی جو' ان لوگوں کی جو" کی صورت بھی دی گئی ہے۔

● اس طرح زیر مطالعہ عبارت (فویل للذین ....) کے تراجم" پس خرابی ہے ان لوگوں کی جو/ سو خرابی ہے ان کی جو/ تو خرابی ہے ان کے لیے جو/ سو بڑی خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو/ تو بڑی خرابی ہوگی ان کی جو" کی صورت میں کیے گئے ہیں۔ اور بعض نے" افسوس" اور" وائے" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی" تو ان لوگوں پر افسوس ہے جو/ پس افسوس ہے ان لوگوں پر جو/ پس/ تو وائے ہے ان پر جو" کی شکل میں۔

[یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ] "یکتبون" کا مادہ "ک ت ب" اور وزن "یفعلون" ہے یعنی یہ اس مادہ سے فعل مجرد (کتب = لکھنا) کے باب نصر سے کا فعل مضارع صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس کا ترجمہ زیادہ تر فعل حال کے ساتھ" وہ لکھتے ہیں" کیا گیا ہے بعض نے صیغہ مضارع" لکھیں" ہی سے کیا ہے جو فعل امر نہیں بلکہ" حال" کے معنی میں ہے۔ دوسرا لفظ" الکتاب" اسی مادہ (ک ت ب) سے فِعَال بمعنی مفعول ہے یعنی" مکتوب/ لکھی ہوئی چیز یا تحریر" اور خود لفظ کتاب بھی اردو میں مستعمل ہے۔ اس مادہ (ک ت ب) سے فعل کے باب اور معنی کے علاوہ خود لفظ" کتاب" کی لغوی تشریح البقرہ: ۲ [۲: ۱۰۱ (۲)] میں دیکھئے۔

[۲: ۷۹: ۱ (۴)] [بِاَیْدِیْهِمْ] یہ تین کلمات کا مرکب ہے۔ ابتدائی "باء (ب)" الجر بمعنی" سے/ کے ساتھ/ کے ذریعے" ہے۔ اور آخر پر ضمیر مجرور" ھم" بمعنی" ان کے/ اپنے" ہے اور درمیان میں وضاحت طلب کلمہ" اَیْدِیْ" ہے [اَیْدِیْ] یہ جمع مکسر یہاں مجرور بباء الجر اور مضاف (لہٰذا خفیف) ہے۔ اس کا واحد" یَدٌ" ہے جس کا مادہ" ی د ی" اور وزن اصلی" فَعْلٌ" ہے۔ اصلی شکل" یَدْیٌ" تھی جو خلافِ قیاس یا شاید کثرتِ استعمال کے باعث" یَدٌ" استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے کئی کلمات (مثلاً وَحْیٌ، ھَدْیٌ، ثَدْیٌ، رَمْیٌ وغیرہ) اپنی اصلی حالت پر رہتے ہیں بہرحال اس میں تعلیل کی صورت کچھ یوں بنتی ہے: یَدْیٌ = یَدْیُنْ = یَدْیُنْ = یَدُنْ = یَدٌ۔ اس کی اعرابی صورتیں (واحد کی" یَدٌ"

یَدًا اور یدٍ " ہوتی ہیں (جو دراصل یَدَیٌ یَدَیًا اور یَدَیٍ تھے) اس کا تثنیہ "یدان (اور یَدَیْنِ) ہوتا ہے اور شاذ "یَدَیَان" بھی آتا ہے)۔ جمع مکسر اس کی "اَیْدِي" (باملاء "آیْدٍ") یَدِیٌّ اور آیادٍ ی آتی ہے مگر قرآن کریم میں صرف مقدم الذکر جمع (ایدِی) ہی استعمال ہوئی ہے۔ یہ بھی دراصل "اَیْدُیٌ" (بروزن "اَفْعُلٌ") ہی تھا پھر اس میں "ی" کی تنوین اڑا کر "د" (عین کلمہ) کے نیچے تنوین (ٍ) دی گئی جو تنوین جر نہیں بلکہ تنوینِ عوض ہے جیسے یائی اللام افعال بابِ "تفعّل" کے مصدر میں تبدیلی ہوئی ہے مثلاً "تَلَقُّیٌ" سے تَلَقٍّ اور تَرَقُّیٌ سے ترقٍّ بنتا ہے۔ گویا اَیْدُیٌ = اَیْدُیْنٌ = اَیْدِیْنٌ = اَیْدِیْنٌ = اَیْدِنْ = ایدٍی ہے اس کی اعرابی گردان ایدٍ - اَیدِیًا - اَیدٍ (مثل قاضٍ، قاضیًا، قاضٍ) ہے اور رفع اور جر میں مضاف یا معرف باللام ہوتے وقت "اَیْدِیْ" ہو جاتا ہے (یعنی "یاء" لوٹ آتی ہے) جیسے یہاں زیر مطالعہ لفظ میں ہے۔

● لفظ "یَد" کا ترجمہ "ہاتھ" ہے۔ عربی میں یہ لفظ "ہاتھ کی انگلیوں سے لے کر کندھے تک پورے بازو کے لیے آتا ہے۔ پھر صرف انگلیوں والے حصے کو بھی "یَدٌ" (ہاتھ) ہی کہتے ہیں اور انگلیوں سے کہنی تک کے حصے کو بھی۔ (جیسے المائدہ:۶ میں آیا ہے) یہ اس لفظ کے حقیقی معنی ہیں (یعنی جس کے لیے دراصل زبان میں یہ لفظ بنایا گیا ہے) پھر اس سے استعارہ، تشبیہ اور محاورے کے طور پر یہ لفظ بیس سے بھی زیادہ معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ واحد مفرد یا مرکب ۱۲ جگہ، تثنیہ مفرد یا مرکب ۳۲ جگہ اور جمع مفرد یا مرکب ۶۵ جگہ آیا ہے۔

● کسی عبارت میں اس لفظ کے معنی (واحد ہو یا تثنیہ یا جمع) متعین کرنے کا عام اصول تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر تو لفظ کے حقیقی معنی ہی مراد لیے جائیں گے۔ سوائے اس کے کہ کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جس کی بناء پر کوئی مجازی معنی لینا ضروری ہو۔ اور اس قرینہ کی موجودگی یا عدم موجودگی کے بارے میں اختلاف بلکہ بعض دفعہ گمراہی کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں اس لفظ کے معنی مراد متعین کرنے میں لغات، زبان کے محاورے (id iom) اور سیاق و سباق عبارت کے علاوہ ماثور معنی (جو نبی کریمؐ یا آپ کے صحابہؓ سے ثابت ہوں) کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جو مستند تفاسیر میں بیان ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس لفظ کے استعمال کا تعلق کسی جگہ علم الکلام (عقائد) سے ہے اور کسی جگہ تشریع اور فقہی احکام سے ہے اس لیے اس کے معنی کے تعین میں محض خواہش کی پیروی میں اس لفظ کے ڈکشنری میں دیئے گئے متعدد معانی میں سے اپنی مرضی کے معنی تلاش کرنے کی کوشش ایک خطرناک کام ہے۔

● پوری عبارت (یکتبون الکتاب بایدیھم) کے ترجمے (وہ لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے) میں "اپنے ہاتھوں سے" کی بجائے بعض نے اردو محاورے کی بناء پر "بایدیھم" (جمع) کا ترجمہ واحد سے کر دیا ہے یعنی "اپنے ہاتھ سے" کہ آدمی ایک ہاتھ سے ہی لکھتا ہے۔ مگر یہاں لکھنے والوں کی جمع (الذین اور یکتبون میں) کے باعث لفظ "اَیْدِیْ" بصورت جمع آیا ہے (اردو میں لفظ "ہاتھ" جمع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہیں "ان کے ہاتھ")۔ اور بلحاظ حقیقت جمع بمعنی "واحد" ہے۔

● محض "لکھتے ہیں" (یکتبون) کی بجائے ساتھ "اپنے ہاتھوں سے" (بایدیھم) مزید تاکید کے لیے آیا ہے کیونکہ لکھا تو ہاتھ سے ہی جاتا ہے اور آدمی اپنے ہی ہاتھ سے لکھتا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا" یعنی ضرور دیکھا۔ ورنہ ہر شخص آنکھوں سے ہی دیکھتا اور اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتا ہے (کسی دوسرے کی سے نہیں)۔

[ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ] "ثُمَّ" بمعنی پھر/اس کے بعد (دیکھئے ۲: ۲۰: ۱ (۴)) اور "یقولون" (وہ کہتے ہیں) کے مادہ، باب اور تعلیل وغیرہ کے لیے دیکھئے [۲: ۱۹: ۱ (۱)] اس فعل کے مادہ (ق ول) سے فعل مجرد پر پہلی دفعہ البقرہ: ۸ [۲: ۷: ۱ (۵)] میں بات ہوئی تھی۔ اب تو اس کے متعدد صیغے گزر چکے ہیں۔

● اس حصۂ عبارت کا ترجمہ تو ہے "پھر وہ کہتے ہیں"۔ جسے بیشتر مترجمین نے سیاقِ عبارت کے ساتھ اردو محاورے کی مطابقت کرتے ہوئے "پھر کہہ دیتے ہیں" سے ترجمہ کیا ہے۔ اور بعض نے "اور کہتے ہیں" سے ترجمہ کیا ہے یعنی ثُمَّ کا ترجمہ "اور" سے کیا ہے جو آیت کے سابقہ مضمون کی مناسبت سے ہی درست کہا جا سکتا ہے ورنہ اصل لفظ سے تو ہٹ کر ہے۔ بعض نے (یکتبون کی طرح) یہاں بھی مضارع کے ساتھ ہی ترجمہ کیا ہے یعنی "پھر کہہ دیں/پھر کہیں"۔ ایسے موقع پر اردو میں فعل مضارع (امر کے نہیں بلکہ) حال ہی کے معنی دیتا ہے۔

[ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ] اس جملے کے تمام کلمات پہلے گزر چکے ہیں اگر ان کی لغوی تشریح کی ضرورت محسوس کریں تو "ھٰذا" (یہ) اور دوسرے اسماء اشارہ کے لیے [۲: ۱: ۱ (۱)] "مِن" (میں سے/سے) کے معنی و استعمال کے لیے "بحث استعاذہ" اور البقرۃ: ۳ [۲: ۲: ۱ (۵)] "عِندَ" (کے پاس/کے نزدیک) ظرف کے استعمال و معانی کے لیے [۲: ۳۴: ۱ (۶)] کی طرف رجوع کریں۔ اسم جلالت (اللہ) کی لغوی بحث "بسم اللہ" میں گزر چکی ہے۔

● اس طرح اس جملے کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "یہ ہے اللہ کے پاس سے"۔ بعض مترجمین نے تو

"مِن " اور" عِندَ " دونوں کے معنی ترجمہ میں شامل کیے ہیں یعنی' یہ نزدیک اللہ تعالیٰ کے سے ہے/ یہ خدا کے پاس سے ہے/ یہ اللہ کے ہاں سے ہے" کی صورت میں۔ اور بعض نے اردو محاورے کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں "عند" کا ترجمہ نظر انداز کر دیا ہے یعنی" یہ خدا کی طرف سے ہے" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ اور بعض نے" اتری ہے/ آئی ہے" کے تفسیری الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ جس کی یہاں چنداں ضرورت نہ تھی۔

[لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا] "لِيَشْتَرُوا" کا مادہ "ش ر ی" اور وزن اصلی "لِيَفْتَعِلُوا" ہے جو دراصل" لِيَشْتَرِيُوا بنتا تھا پھر واو الجمع سے ماقبل والا حرف علت (ی) گرا کر اس کے ماقبل (ر) کی کسرہ (ـِ) کو ضمہ (ـُ) میں بدل دیا جاتا ہے۔ یہ صیغہ فعل اس مادہ سے باب افتعال کا فعل مضارع منصوب (بوجہ لامِ کَیْ) صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ اس مادہ اور اس سے اس باب کے فعل (اشتری یشتری = خریدنا) کے استعمال پر البقرہ: ۱۶ [۲: ۱۲: ۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے "بہ" کی باء (بِ) کے معانی کے لیے البقرہ: ۴۵ [۲: ۳۰: ۱(۱)] "ثمن" (جو یہاں منصوب آیا ہے) کے معنی (قیمت) کے علاوہ اس کے مادہ فعل مجرد اور پھر فعل (اشتری) کے ساتھ اس کے استعمال اور اس کے ساتھ (بہ والے) "بِ" کے استعمال پر بھی البقرہ: ۴۱ [۲: ۲۸: ۱(۱۱)] میں بات گزر چکی ہے اور اسی جگہ لفظ "قلیل" بمعنی" تھوڑا" (جو عبارت میں منصوب آیا ہے) کے مادہ فعل، وزن وغیرہ کی بات بھی ہوتی تھی۔

● اس طرح یہاں اس عبارت کا لفظی ترجمہ بنتا ہے" تاکہ وہ خرید لیں اس کے ساتھ/ سے تھوڑی قیمت"۔ مختلف مترجمین نے یہاں" لیشتروا" کے تراجم" تاکہ لیویں/ کر لیویں/ کہ وصول کر لیں/ کہ حاصل کر لیں/ کہ اس کو بیچ کر لیویں" کی صورت میں کیے ہیں پھر اردو محاورے کے مطابق وہ فعل کے اس ترجمہ کو فقرے کے آخر پر لاتے ہیں۔

اسی طرح "بہ" کے تراجم" اس کے ذریعے سے/ اس کے عوض/ بدلے/ اس سے"/ کیے ہیں۔ اور بعض نے" اس پر" کیا ہے جس میں لفظ سے زیادہ محاورہ کا خیال رکھا گیا ہے اور" ثمنا قلیلا" کا ترجمہ" مول تھوڑا/ تھوڑا مول/ کچھ نقد قدرے قلیل/ تھوڑے سے دام/ قدرے قلیل معاوضہ" کی صورت میں کیا گیا ہے ان تراجم میں" نقد" اور معاوضہ" ثمن" (قیمت) کے لیے لائے گئے ہیں۔

[فَوَيْلٌ لَهُمْ] "وَيْل" کے معنی و استعمال پر ابھی اوپر [۲: ۴۹: ۱(۳)] میں بات ہوئی ہے۔ "فَ" (پس/ سو) اور" لَهُمْ" (ان کے لیے) کا ابتدائی" لام الجر" لفظ" ویل" کے مرفوع استعمال

کا ایک حصہ ہے۔ یوں اس عبارت (فویل لھم) کے تراجم "بس وائے ہے واسطے ان کے/سو خرابی ہے ان کو/سو بڑی خرابی آوے گی ان کو/بس افسوس ہے ان پر/سو خرابی ہے ان کے لیے/ خرابی ہے ان کی" کی صورت میں کیے گئے۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے البتہ "آوے گی" وضاحتی ترجمہ ہے۔

[مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ] اس عبارت کے جملہ کلمات پہلے گزر چکے ہیں۔ "مِمَّا (جو مِن + مَا ہے) میں "مِن" تعلیل (کی وجہ سے) کے معنی میں آیا ہے اور "مَا" موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور مصدریہ بھی موصولہ کی صورت میں "مِمَّا" کا ترجمہ "اس چیز کی وجہ سے جو/ اس سے کہ/ اس کی بدولت جس کو/ جس سے/ اس کی بدولت جو" کے ساتھ کیا گیا ہے اور "كَتَبَتْ" کا ترجمہ تو ہے اور اس (مؤنث) نے لکھا۔ مگر مَا کو مصدریہ سمجھ کر ترجمہ "لکھے سے/ اس لکھنے پر" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ "ایدیھم" (جو یہاں فاعل ہو کر آیا ہے) کا ترجمہ "ہاتھ ان کے/ان کے ہاتھوں نے" بنتا ہے جسے بعض نے "ان کے ہاتھوں سے" کیا ہے جو لفظ سے ہٹ کر ہے۔

● اس طرح زیر مطالعہ پوری عبارت (مماکتبت ایدیھم) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "اس کی وجہ سے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے"۔ جسے سیاق عبارت (اور سابقہ فعل "یکتبون") کی مناسبت سے بعض نے فعل حال کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی "اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں"۔ ویسے بھی یہ ترجمہ "یکتبون بایدیھم" کا لگتا ہے اگر حال ہی میں کرنا تھا تو بھی ترجمہ "لکھتے ہیں ان کے ہاتھ" ہونا چاہیے تھا اکثر مترجمین نے "مَا" کو مصدریہ سمجھ کر تراجم "اپنے ہاتھوں کے لکھے سے/ان کے ہاتھوں کے لکھے سے/ان کے اس لکھنے پر" کی صورت میں کیے ہیں۔ ان تراجم میں (ماسوائے آخری کے) "لکھنے" کی نسبت "ہاتھوں" سے ہی ہے جو اصل عبارت کا تقاضا ہے۔

[وَوَيْلٌ لَّهُمْ] سابقہ "فویل لھم" کی طرح ہے سوائے اس کے کہ یہاں شروع میں واو عاطفہ بمعنی "اور" ہے۔

۲ : ۴۹ : ۱ (۵) [مِمَّا يَكْسِبُوْنَ] یہاں بھی مِمَّا (من + ما) کا "من" تبعیضیہ نہیں بلکہ تعلیلیہ [دیکھئے ۲ : ۱ : ۱ (۵)] بمعنی "اس کی وجہ سے" ہے اور اسی لیے اس (مِمَّا) کا ترجمہ "اس کی بدولت جو/ کہ/اس کی بدولت جس کو/اس لیے کہ/اس چیز سے کہ" کی صورت میں کیا گیا ہے۔

[يَكْسِبُوْنَ] کا مادہ "ک س ب" اور وزن "یَفْعِلُوْنَ" ہے۔ فعل مجرد اس سے کَسَبَ ... یکسِبُ کَسْبًا (ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں .... کو جمع کرنا ... کمانا۔ مثلاً کہتے ہیں "کسب المالَ

(مال کمایا یا جمع کیا) اور "کسب الاثم" (اس نے گناہ کمایا/اٹھایا/سر لیا) اور "کسب لاھلہ" کا مطلب ہے "اس نے اپنے گھر والوں کے لیے روزی/معاش طلب کی"۔ کبھی یہ فعل دو مفعول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مثلاً "کسب فلانًا مالاً/علمًا" (اس نے فلاں کو علم یا مال حاصل کرایا۔ یعنی اس تک پہنچا دیا) تاہم اس فعل کا یہ (دو مفعول والا) استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا۔

● اس فعل میں بنیادی طور پر تو کسی نفع بخش شے کے حصول کی کوشش۔ یا خوش نصیبی حاصل کرنے کی کوشش" کا مفہوم ہوتا ہے۔ تاہم کبھی یہ "نفع کی بجائے نقصان اٹھا بیٹھنے" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا استعمال نیکی بدی دونوں کے لیے آتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کا زیادہ استعمال "بدی" کے لیے آیا ہے۔ یہ متعدی فعل ہے اور اس کا مفعول بنفسہ (منصوب) آتا ہے۔ البتہ بعض دفعہ مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے۔ زیادہ تر استعمال اس کا "مَا" کے ساتھ آیا ہے یعنی دراصل "ما" مفعول ہوتا ہے جو فعل سے پہلے مذکور ہوتا ہے۔ اور فعل کے بعد اس (مـا) کے لیے عائد ضمیر (مفعول) محذوف ہوتی ہے۔ جیسے یہاں زیرِ مطالعہ آیت میں ہے (گویا اصل تھا "ممّا یکسبونہ")

● اس طرح اس عبارت "ممّا یکسبون" کا ترجمہ بنتا ہے "بوجہ اس کے جو کہ وہ کماتے ہیں"۔ جسے بعض نے "ایسی کمائی کرتے ہیں/حاصل کرتے ہیں/کام کرتے ہیں" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ اور بہت سے مترجمین نے یہاں "مَا" کو مصدریہ سمجھ کر ترجمہ "اپنی کمائی سے/اس کمائی سے/اس کمائی پر/اپنی کمائی/اپنی اس کمائی" کی صورت میں کیا ہے۔ اس میں "سے" اور "پر" دراصل "کی وجہ سے" (مِنْ) کا مفہوم رکھتے ہیں۔ بعض نے ماضی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے (وصول کر لیا کرتے تھے) جو اصل عبارت کے مطابق درست معلوم نہیں ہوتا۔

۲:۴۹:۲ الإعراب

بلحاظ ترکیب نحوی زیرِ مطالعہ قطعہ آیات کو چھ جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں سے بعض "واو الحال" اور "ثم عاطفہ" کے ذریعے باہم ملائے گئے ہیں۔ تفصیل یوں ہے:

① وَمِنهُم اُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّا اَمَانِيَّ

[وَ] عاطفہ ہے جو مضمون کے تسلسل کے لیے جملے کو جملے سے ملاتی ہے [مِنهُم] جار مجرور (من + ھم) مل کر خبر مقدم کا کام دے رہے ہیں اور [اُمِّيُّوْنَ] مبتدا مؤخر (لہٰذا) مرفوع ہے اور یہ نکرہ موصوفہ ہے جس میں "جو کہ" کا مفہوم ہوتا ہے۔ (یعنی ان میں سے ہیں کچھ یا بہت سے اَن پڑھ

جو کر) [لایعلمون] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین (ھم) ہے اور [الکتاب] اس فعل کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے علامتِ نصب آخری "باء" کی فتحہ (بَ) ہے یہ جملہ (لایعلمون الکتابَ) "امیّون" (نکرہ موصوفہ) کی صفت ہے اس لیے اسے محلاً مرفوع کہہ سکتے ہیں (یعنی جو نہیں جانتے کتاب کو) [اِلاَّ] حرفِ استثناء ہے اور [امانِیَّ] مستثنیٰ باِلاّ ہے اور یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ "علم الکتاب" اور "امانِیّ" دو بالکل الگ چیزیں ہیں اس لیے یہاں "امانِیّ" کی نصب لازمی ہے (چاہے استثناء سے پہلے جملہ منفی بھی ہے) یعنی "ان کے پاس "علمِ کتاب" نہیں بلکہ صرف (جھوٹی) آرزوئیں ہیں"۔ اس عبارت (لا یعلمون الکتاب اِلاّ امانِیَّ) کی ایک اور توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ فعل "علِم" کو یہاں دو مفعول کے ساتھ آنے والا فعل سمجھا جائے جیسے "اِن عَلِمتُموھُنّ مؤمناتٍ" (الممتحنۃ : ۱۰) میں استعمال ہوا ہے۔ (یعنی اگر تم ان عورتوں کو ایمان والیاں جانو/سمجھو)۔ اس صورت میں ترجمہ ہوگا: "وہ نہیں جانتے/سمجھتے کتاب کو مگر صرف آرزوؤں کا مجموعہ" گویا وہ ایسے جاہل ہیں کہ کتابِ الٰہی کو مجموعہ اوامر و نواہی (جن پر عمل مطلوب ہے) نہیں بلکہ محض "مجموعہ اوراد و وظائف" ہی سمجھتے ہیں جو "دل خوش رکھنے کا سامان" ہے۔

(۲) وان ھم الا یظنون

[وَ] یہاں حالیہ ہے اور [اِن] نافیہ بمعنی "مَا" ہے [ھم] ضمیر مرفوع منفصل مبتداء ہے۔

[اِلاَّ] حرفِ استثناء ہے جو یہاں حصر کے لیے آیا ہے کیونکہ اس سے پہلے نفی (اِنْ) آئی ہے یعنی یہ بمعنیٰ "صرف و محض" آیا ہے کیونکہ "نہیں ہے مگر" مل کر "صرف" کا مفہوم دیتا ہے [یظنّون] فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعلین "ھم" (مستتر) جملہ فعلیہ بن کر "ھم" (مبتداء) کی خبر ہے۔ دراصل تو یہاں لفظ "قوم" خبر مقدر ہے جس کی صفت "یظنون" ہے یعنی مفہوم عبارت "وَاِنْ ھم اِلاّ قومٌ یظنون" (حالانکہ وہ صرف ایسے لوگ ہیں جو ظن میں مبتلا ہیں) ہے اور یہ پورا جملہ (وان ھم الا یظنون) حالیہ ہے جو سابقہ جملے کے فعل "لایعلمون" کی ضمیر فاعلین (ھم) کا حال ہونے کی بنا پر اسی سابقہ جملے (ومنھم امیون لایعلمون الکتاب الا امانی) کا ہی ایک حصہ شمار ہوگا کیونکہ حال ذوالحال ایک جملے میں شامل ہوتے ہیں۔ چاہیں تو ایک دفعہ اس جملے (وان ھم الا یظنون) کے تراجم پر (حصہ اللغۃ میں) نظر ڈال لیں۔

(۳) فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم

[فَ] یہاں مستانفہ ہے یعنی یہاں سے ایک الگ جملہ اور الگ مضمون شروع ہوتا ہے یا

اس "فاء" کو سببیہ بھی سمجھا جا سکتا ہے یعنی "اس کی وجہ سے" کے معنی میں۔ [ویلٌ] مبتداء (لہٰذا) مرفوع ہے جو یہاں بد دعا کے لیے آیا ہے اور دعا یا بد دعا کی صورت میں مبتداء نکرہ لایا جا سکتا ہے جیسے "سلامٌ علیکم" میں ہے [للذین] لام الجر (لِ) کے بعد "الذین" اسم موصول ہے جو مبنی ہے لہٰذا مجرور بالجر ہونے کے باوجود اس میں کوئی اعرابی علامت ظاہر نہیں ہے۔ اس کے بعد [یکتبون] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "ھم" ہے جو "الذین" کے لیے ہے اور یہ جملہ فعلیہ (یکتبون) اس "الذین" کا صلہ ہے بلکہ یہ صلہ آگے چلتا ہے یعنی صلہ والا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔ چنانچہ آگے [الکتاب] اسی فعل (یکتبون) کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے [بایدیھم] میں باء الجر (ب) کے بعد "ایدی" مضاف اور "ھم" مضاف الیہ ہے اور یہ مرکب اضافی (ایدیھم) باء الجر کے باعث اس کا مضاف (ایدی) مجرور ہے علامت جر اس میں آخری یاء ماقبل مکسور (ی) کا سکون ہے (جو دراصل "بایدِیھِمْ" تھا مگر یاء مکسور یا مضموم ماقبل مکسور ساکن ہو جاتی ہے) اور یہ مرکب جاری (بایدیھم) متعلق فعل "یکتبون" ہے اور اس طرح دراصل پورا جملہ "یکتبون الکتابَ بایدیھم" (جس میں فعل فاعل مفعول اور متعلق فعل شامل ہیں) "الذین" کا صلہ بنتا ہے۔ اور یوں یہ پورا صلہ موصول ابتدائی لام الجر (لِ) کے ذریعے "ویلٌ" کی خبر کا کام دیتا ہے۔ اس جملے کے تمام اجزاء کے تراجم حصہ "اللغہ" میں بیان ہو چکے ہیں۔

④ ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا ؕ

[ثُمَّ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے مابعد والے فعل (یقولون) کو سابقہ جملے والے فعل (یکتبون) پر عطف کیا گیا ہے یعنی "لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں" [یقولون] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "ھم" ہے [ھذا] مبتداء ہے اور [من عند اللہ] میں "من" حرف الجر اور "عند" ظرف مضاف اور مجرور بالجر (من) بھی ہے اور "اللہ" مجرور بالاضافہ یعنی مضاف الیہ ہے اور یہ سارا مرکب جاری (من عندِ اللہِ) "ھذا" کی خبر یا قائمقام خبر ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ (ھذا من عند اللہ) فعل "یقولون" کا مقول (مفعول) ہونے کے اعتبار سے محلاً منصوب ہے [لیشتروا] کا ابتدائی لام (لِ) لامِ کَیْ یا لامِ تعلیل ہے جس کی وجہ سے "لیشتروا" فعل مضارع منصوب ہے (لامِ تعلیل کے بعد ایک "اَنْ" مقدر سمجھا جاتا ہے اور دراصل وہی ناصب ہوتا ہے یعنی "لِاَن") علامت نصب اس صیغہ فعل میں آخری "ن" کا گر جانا ہے (جو دراصل "لیشترون" تھا) اور اس صیغہ میں واو الجمع ضمیر الفاعلین (ھم) کی علامت ہے۔ [بہ] جار مجرور (ب + ہ) متعلق فعل (لیشتروا) ہیں [ثمناً] اس فعل کا

مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے اور [قلیلاً] اس کی صفت (لہٰذا منصوب) ہے اس طرح "ثمنا" کے ذریعے یہ دونوں جملے (۳ و ۴ مندرجہ بالا) دراصل ایک ہی طویل جملہ (بلحاظ مضمون مربوط) بنتا ہے۔

⑤ فویل لھم مما کتبت ایدیھم

[ف] یہاں بھی استیناف کے لیے ہے یعنی یہاں سے ایک الگ جملہ شروع ہوتا ہے۔ اور اسی لیے سابقہ جملے کے آخر پر (ثمنا قلیلا کے بعد) وقف مطلق کی علامت (ط) ڈالی جاتی ہے [ویلٌ] سابقہ جملے (۳ مندرجہ بالا) کی طرح یہاں بھی مبتدا ہے (نکرہ ہونے کا جواز بھی اوپر بیان ہوا ہے) یہاں بددعا کی تکرار تاکید لفظی کے لیے ہے۔ [لھم] جار مجرور مل کر "ویل" کی خبر کا کام دے رہے ہیں [مِمَّا] جو جارّ (من) اور مجرور (مَا موصولہ) ہیں۔ ان کا تعلق بھی "ویل" سے ہے یعنی "ویل" (تباہی) اس سبب سے ہے کہ۔ [کتبت] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ [ایدیھم] مضاف (ایدی) اور مضاف الیہ (ھم) مل کر فعل "کتبت" کا فاعل ہے اس لیے ایدی یہاں حالت رفع میں ہے۔ مگر اسم منقوص میں رفع اور جر کی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ یا یوں سمجھیے کہ یہ دراصل "اَیْدِیُھُمْ" تھا مگر یائے مضمومہ (اور یائے مکسورہ بھی) کا جب ماقبل مکسور ہو تو وہ ساکن ہو جاتی ہے (جیسے "یَرْمِیُ" سے "یَرْمِیْ" ہو جاتا ہے) اور فاعل (ایدی) کے جمع مکسر ہونے کی وجہ سے فعل (کتبت) کا صیغہ واحد مؤنث لایا گیا ہے۔ یہاں "مِمَّا" کے "مَا" کو موصولہ بھی سمجھا جا سکتا ہے اس صورت میں جملہ "کتبت ایدیھم" اس کا صلہ ہے اور ترجمہ "اس کی وجہ سے جو کہ (لکھا ان کے ہاتھوں نے) ہوگا۔ اور اس "مَا" کو مصدریہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں "کتبت" کا ترجمہ مصدر مؤول "کتابۃ" کے ساتھ (یعنی "من کتابۃ ایدیھم" کی طرح "ان کے ہاتھوں کے لکھنے کی وجہ سے" کے ساتھ ہوگا۔ دونوں طرح کے تراجم حصّہ "اللغہ" میں بیان ہو چکے ہیں۔

⑥ وَوَیلٌ لھم مما یکسبُون

[وَ] عاطفہ ہے جس سے (اگلے) جملے کا (پچھلے) جملے پر عطف ہے [وَیلٌ] مثل سابق مبتدا (لہٰذا) مرفوع ہے نکرہ ہونے کی وجہ اوپر بیان ہوئی ہے [لھم] جار مجرور (ل + ھم) مل کر "ویلٌ" کی خبر کا کام دے رہے ہیں [مِمَّا] جار مجرور (من + ما) کا تعلق "ویل" سے ہے یعنی اس کی وجہ بیان کی گئی ہے [یکسبُون] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "ھم" (مستتر) ہے یعنی جملہ فعلیہ ہے اور یہاں بھی اگر "مِمَّا" کے "مَا" کو موصولہ سمجھا جائے تو یہ (یکسبُون) اس کا صلہ ہے

اور اس کے آخر پر ضمیر عاید محذوف ہے (یعنی مفہوم "یکسبونہ" کا ہے۔ اور اگر "مِمَّا" کے "مَا" کو مصدریہ سمجھیں تو ترجمہ مصدر مؤوّل "کسب" کے ساتھ "من کسبھم" کی طرح کیا جائے گا۔ دونوں طرح سے تراجم حصّہ "اللغہ" میں گزر چکے ہیں۔ یہ آخری جملہ "وَ" عاطفہ کے ذریعے سابقہ جملے (۵) کا ہی ایک حصّہ بنتا ہے یعنی دونوں کے ترجمے کے درمیان "اور" کا ہی اضافہ ہوگا۔

۲:۴۹:۳ الرسم

قطعہ زیر مطالعہ کے تمام کلمات کا رسم املائی اور رسم عثمانی یکساں ہے۔ البتہ تین کلمات وضاحت طلب ہیں۔ یعنی "الکتب"، "مِمَّا" اور "ھذا"۔ کلمہ "الکتب" جس کا رسم املائی "الکتاب" ہے۔ (جو یہاں دو دفعہ آیا ہے) قرآن مجید میں یہ ہر جگہ (سوائے چار خاص مقامات کے) بحذف الف بعد التاء لکھا جاتا ہے معرفہ ہو یا نکرہ اور مفرد ہو یا مرکب۔ "مِمَّا" (یہ بھی یہاں دو دفعہ ہے) یہ دراصل "من ما" ہے مگر قرآن میں عموماً ہر جگہ موصول (ملاکر) "مِمَّا" لکھا جاتا ہے ان دونوں کلمات (الکتاب اور مِمَّا) کے رسم پر تفصیلی بحث [۲:۱:۳] میں ہو چکی ہے۔

● کلمہ "ھذا" کا رسم الخط اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس کا رسم عثمانی اور عام رسم املائی دونوں اسی طرح بحذف الالف بعد الہاء (یعنی "ھذا") ہے (حالانکہ بظاہر رسم قیاسی "ھاذا" ہونا چاہیئے تھا)۔ اس طرح کے بعض کلمات (مثلاً ذٰلك۔ اولٰئك وغیرہ) پہلے بھی گزر چکے ہیں اور آئندہ بھی ایسے کئی کلمات ہمارے سامنے آئیں گے جن کا رسم املائی۔ عام قیاسی رسم کی بجائے۔ رسم قرآنی والا ہی اختیار کیا گیا۔ یعنی ان کا رسم املائی دراصل رسم عثمانی کی یادگار ہے۔ اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اصل چیز رسم قرآنی یا رسم عثمانی (عہد نبوی اور خلافت راشدہ تک کا رائج رسم الخط) ہی تھا۔ اس میں بعض اصلاحات یا تبدیلیاں کرکے رسم املائی کے قواعد بنائے گئے۔ یہ نہیں کہ رسم املائی کو توڑ مروڑ کر کسی مصلحت کے تحت، رسم عثمانی بنایا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر کتب رسم میں بیان کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں بہت سے کلمات ایسے ہیں جن کی املاء (رسم) صوتی اصول کے تحت نہیں۔ بلکہ تاریخی اصول کے تحت اختیار کی گئی ہے۔

۲:۴۹:۴ الضبط

ان دو آیات کے کلمات میں ضبط کا تنوع درج ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یکساں ضبط والے کلمات شامل نہیں کیے گئے۔

وَمِنْهُمْ، مِنْهُمْ/ اُمِّيُّوْنَ، أُمِّيُّوْنَ، اُمِّيُّونَ/ لَا. لَا. لَا/
يَعْلَمُوْنَ، يَعْلَمُونَ. يَعْلَمُونَ/ الْكِتٰبَ، اَلْكِتٰبَ،
اَلْكِتٰبَ/ اِلَّا. اِلَّا. اِلَّا. اِلَّا/ اَمَانِيَّ، اَمَانِيَّ. اَمَانِيَّ. اَمَانِيَّ/
وَاِنْ، اِنْ، اِنْ/ هُمْ، هُمْ/ اِلَّا (مثل سابق)/ يَظُنُّوْنَ،
يَظُنُّوْنَ، يَظُنُّوْنَ/ فَوَيْلٌ، فَوَيْلٌ/ لِّلَّذِيْنَ. لِلَّذِيْنَ. لِلَّذِيْنَ. لِلَّذِيْنَ/
يَكْتُبُوْنَ، يَكْتُبُوْنَ. يَكْتُبُوْنَ/ الْكِتٰبَ (مثل سابق)، بِاَيْدِيْهِمْ،
بِاَيْدِيْهِمْ، بِاَيْدِيْهِمْ/ ثُمَّ، ثُمَّ/ يَقُوْلُوْنَ، يَقُوْلُوْنَ. يَقُوْلُوْنَ/
هٰذَا، هٰذَا، هٰذَا/ مِنْ، مِنْ/ عِنْدِ، عِنْدِ. عِنْدِ/ اللّٰهِ، اللّٰهِ،
اللّٰهِ/ لِيَشْتَرُوْا. لِيَشْتَرُوْا. لِيَشْتَرُوْا/ بِهٖ، بِهٖ، بِهٖ/ ثَمَنًا. ثَمَنًا.
ثَمَنًا/ قَلِيْلًا. قَلِيْلًا، قَلِيْلًا، قَلِيْلًا/ فَوَيْلٌ (مثل سابق)، لَهُمْ، لَهُمْ/
مِمَّا، مِمَّا، مِمَّا/ كَتَبَتْ، كَتَبَتْ/ اَيْدِيْهِمْ (مثل سابق)، وَوَيْلٌ (مثل
سابق)، لَهُمْ مِمَّا (مثل سابق)، يَكْسِبُوْنَ. يَكْسِبُوْنَ، يَكْسِبُوْنَ۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۹۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت، قیمت فی نسخہ -/۱۲ روپے

be the last nail in their coffin. This time Divine punishment appeared in the form of Roman armies, and the Holy City was destroyed for the second time.

The Romans had appointed Agrippa I, grandson of Herod the Great, to rule the territories that has once been under Herod himself. Soon afterwards, a serious protest against the Romans led to an open Jewish revolt in 66 CE, which neither King Agrippa II nor the Roman procurator was able to contain. The Romans retaliated with full military might, ultimately leading to the destruction of Jerusalem in 70 CE by the armies of General Titus. The loss of life among the Jews was incredibly high, as 133 thousand are reported to be put to sword in Jerusalem alone. Thousands were made slaves, starved to death, or killed in Roman amphitheaters. Herod's Temple was burned and completely demolished.

Emperor Hadrian later built a new Roman colony, called *Aelia Capitolina*, over the desolate ruins of Jerusalem. However, the Jews were banished from their Holy City and were not allowed to re-enter for the next half a millennia.

As mentioned before, the advent of Prophet Muhammad (Peace be upon him) in the 7th century CE constituted a golden opportunity for the Jews to escape from the wrath of God the Almighty. They, however, as a community not only rejected the Prophethood of Muhammad (Peace be upon him), but also earned the unenviable reputation of being the worst enemy of Islam and Muslims. As a result, their second era of decline has continued till the present, and they remained, to this date, a condemned and disgraced people. We shall return to this topic after a while.

To be continued

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

killed during the three month siege of the Holy City, and by the time the Roman army broke through the walls of Jerusalem, they were killing each other in confusion.

The Romans abolished the Maccabean dynasty and appointed Antipater as their puppet ruler. But soon after Julius Caesar's murder in 44 BC, Antipater was poisoned and a civil war ensued in Palestine with different groups vying for dominance. To restore order, the Romans nominated a clever Jew named Herod as their viceroy to rule the Israelites. Herod reigned for the next 33 years by patronizing the Jewish religious hierarchy on the one hand, and propagating the Greco-Roman culture and showing his faithfulness to Caesar on the other hand. In order to demonstrate his loyalty to Judaism, he ordered the third construction of the Temple. The result was the largest and most magnificent building complex of the ancient world. However, the moral degeneration of the Jews continued and reached to the lowest possible ebb during the reign of Herod.

After Herod's death, his kingdom got divided among his three sons: (a) Archelaus became the ruler of Smaria, Judeae, and northern Edom, but was replaced in 6 CE by a Roman governor; (b) Antipas became the head of Galilee and Jordan in northern Palestine; whereas (c) Philip ruled the land between river Yermuk and Mt. Hermon

It is significant to note that during all those years of indirect Roman rule, the Jews had, in general enjoyed full religious autonomy. The Romans would obviously intervene in matters of political or military nature but the everyday administration of justice and local affairs -- like the Sanhedrin court in Jerusalem -- were left wholly to the Jewish officials responsible for applying the law.

It was this Jewish court, Sanhedrin, that convicted God's last messenger to the Children of Israel -- Jesus Christ -- of blasphemy, and requested death sentence from the Roman governor Pontius Pilate. The collective rejection of Prophet Jesus (Peace be upon him) by the Israelites was not a minor crime -- as he was God's envoy, or *Rasool* -- and thus their crime proved to

there were those orthodox ones -- or "fundamentalists" in contemporary terms -- who persisted with the traditional Jewish beliefs and culture, as the spirit of revival infused by Prophet Ezra was still very much active among them.

In 175 BC, Antiochus IV came to the throne, and used Hellenization to wipe out both monotheism and the Mosaic Law. He promoted Greek customs and ideas with the help of this aristocratic Jewish collaborators. Pagan altars were set up, religious celebrations and services forbidden, circumcision outlawed, and possession of Torah declared a capital crime. This only sharpened the distinction between the two groups of Jews, and motivated the orthodox ones to rebel.

An elderly priest named Mathathias rejected such outrageous disobedience of the Divine commands. He, along with his five sons, started a revolt in the form of guerrilla warfare. Soon, a group of zealous Jews joined them, who were known as "Hasideans", or the pious ones. An army of devoted Israelites was formed which began a full-fledged revolutionary struggle against their Syrian oppressors, and this came to be called as the "Maccabee" uprising. A long series of battle followed, where these small, untrained, and ill-equipped group of men were able to defeat their much superior rivals. This ultimately led to the establishment of the "Great Maccabee Empire", marking the second phase of rise and domination for the Israelites.

The religious fervor and sincerity among the Jews, however, started to subside with the passage of time. The love of God began to be gradually replaced by the craving for material comforts and wealth. The spirit of morality disappeared, leaving behind the empty form of rituals. Internal conflicts led to a split among the Jews, so much so that some of them invited the Roman general Pompey to come to Palestine. But once the Roman army had arrived, it would not leave.

The Second Era of Decline

In 63 BC Pompey, after taking over the old Sleucid Empire of Syria, turned towards Jerusalem. Thousands of Jews were

progress beyond the laying down of its foundations. Eighteen years latter, Zerubbabel became Judah's governor who, supported by Prophets Haggai and Zechariah and the high-priest Jeshua, completed the second Temple in 515 BC.

In 443 BC, Persian king Artaxerxes I allowed Zehemiah, one of his Jew attendants, to supervise the building of the walls of Jerusalem, and later appointed him governor of Judah as a separate province. Prophet Ezra (or *Uzair*) arrived in Jerusalem in 398 BC, with the mission of re-establishing religious purity and obedience to the Mosaic Law. He persuaded all Jewish men to divorce their pagan wives and proscribed mixed marriages in the future. He also demanded strict adherence to Sabbath and the dietary laws. He took a pledge from his people that they would worship none other that God. A major achievement of Prophet Ezra was that he re-compiled the five Books of Moses, or the Torah, which were lost during the destruction of Jerusalem.

The process of Jewish revival suffered a set back with the rise of Greeks, and the defeat of the Persians by Alexander in 333 BC. After the death of Alexander, his kingdom was divided among his generals. Egypt came under the control of Ptolemy, whose descendants ruled Judah for the next hundred years. Seleucus had established his own dynasty over Babylonia and Syria, whereas Palestine was incorporated into this kingdom by Antiochus III in 198 BC.

Earlier, Alexander had initiated a policy of implanting the Greek culture -- Hellenism -- in his conquered lands. As a result, during all these years of Greek rule, the Jews became divided into two groups. Those living in Egypt and other places outside Judah, called "Jews of the Dispersion", started adopting Greek ideas, dress, language, and life-style. The sacred scriptures had to be translated in Greek as most of them could no longer comprehend their original language, Hebrew. Mixed marriages became common once again, and circumcision was increasingly ignored. A popular Hellensitic idea -- that different nations simply worshipped the same God with different names -- became acceptable among these "progressive" Jews. On the other hand,

Jerusalem. The following statements are taken from the "Book of Ezekiel" in the Old Testament:

> This word of the Lord came to me:
> O man, when the Israelites were living on their own soil they defiled it with their ways and deeds; their ways were loathsome and unclean in my sight. I poured out my fury on them for the blood they had poured out on the land, and for the idols with which they had defiled it. I scattered them among the nations, and they were dispersed in many lands. I passed a sentence on them which their ways and deeds deserved.
>
> (Ezekiel 36:16-19)

> It is not for the sake of you Israelites that I am acting, but for the sake of my holy name...I shall take you from among the nations and gather you from every land, and bring you to your homeland. I shall sprinkle pure water over you, and you will be purified form everything that defiles you; I shall purify you from the taint of all your idols. I shall give you a new heart and put a new spirit within you; I shall remove the heart of stone from your body and give you a heart of flesh. I shall put my spirit within you and make you conform to my statutes; you will observe my laws faithfully. Then you will live in the land I gave to your forefathers; you will be my people, and I shall be your God.
>
> (Ezekiel 36:22,24-28)

God's mercy came in the shape of Cyrus, king of Persia, who, after conquering Media and Lydia, brought the Babylonian Empire to her knees in 539 BC, thus laying down the foundations of the Great Persian Empire. The very next year, Cyrus authorized the Jews in Mesopotamia to return to Jerusalem and rebuild their Temple at the expense of the royal treasury. He then appointed Sheshbazzar, probably the son of King Jehoiachin, to rule Judah as a semi-independent state. Sheshbazzar led the first group of Jews back to their homeland, followed by another expedition led by Zerubbabel in 522 BC. However, because of a number of reasons, the rebuilding of the Temple could not

Nebuchadnezzar decided to make an example of the city, and his orders were carried out with cruel thoroughness. The city walls were demolished. The Temple and the palace were stripped of all valuables and burned to the ground. Thousands were killed, and a large part of the population was taken as captives to Babylonia, more than 500 miles away. The kingdom of Judah itself became a Babylonian province, which presented at that time a deeply scarred look. Everywhere, towns were ransacked and burned, crops destroyed and villages deserted.

Reform & Revival: The Maccabees

The destruction of the northern kingdom of Israel by the Assyrians was irreversibly complete and final. The dispersed Jews lost their distinct identity as they merged with and vanished among the neighboring nations, especially the conquerors. In contrast, the Babylonian exile was only a harsh reminder from Almighty God to the inhabitants of Judah.

Although the exiles were not subjected to blatant slavery, the impact of captivity was still soul-crushing for them. They must have felt humiliated and anguished with the memory of their abject defeat and ongoing bondage, as depicted in the poetry composed during that period (see "*Lamentations*" in the Old Testament). In Babylonia, the Jews were made targets of contempt and derision; they were required to toil hard and pay tribute money in exchange for their existence. Those of noble origin were particularly treated with indignity, adding the pain of insult to their already injured souls.

All this must have melted their hearts and caused them to repent. There were a number of active reformers, both among the captives and among those who remained in Judah, preaching and exhorting everyone to fulfill their part of the Covenant. Most prominent among these voices of reform was that of Prophet Ezekiel, who had been brought to Babylonia during the first deportation in 597 BC. He called his people towards God, inspiring them to mend their ways and atone for their sins. He announced that Almighty God is going to give the Israelites another chance to repent, and that He will cause them to return to

they are all mighty warriors,
their jaws are a grave, wide open.
to devour your harvest and your food,
to devour your sons and your daughters,
to devour your flocks and your herds,
to devour your vines and your fig trees
They will beat down with the sword
the walled cities in which you trust.
(Jeremiah 5:15-17)

Despite all these explicit and unambiguous warnings -- delivered to the inhabitants of Judah by two of their great prophets -- there was no sign of any remorse or repentance whatsoever. Instead, the Israelites stubbornly continued in their pagan practices and disobedience of Divine injunction, thereby inviting the wrath of God.

Divine punishment first appeared in the form of Babylonian forces marching into Judah in 604 BC, when King Jehoiakim acquiesced without any struggle and agreed to pay heavy tribute to Nebuchadnezzar, the king of Babylonia. He, however, rebelled against his Babylonian overlords in 601 BC, resulting in the first siege of Jerusalem that lasted three months. The armies of Nebuchadnezzar entered the Holy City on March 15, 597 BC, and plundered the Temple of Solomon. They decimated the society by deporting the new King Jehoiachin (Jehoiakim's son), his family, noblemen, and thousands of influential citizens, soldiers, and skilled craftsmen as captives to Babylonia. Nebuchadnezzar then placed the king's uncle Zedekiah on the throne of Judah. Soon Zedekiah also became involved in a conspiracy against Babylonia, resulting in the second siege of Jerusalem. This time the city remained under siege for 18 months, and the conditions deteriorated to such an extent that some of the inhabitants were forced to eat human flesh.

Finally, the wall of Jerusalem was breached on July 9, 587 BC. The rebellious vassal king was captured and was forced to watch as his sons were slaughtered. Then he was blinded and taken in chains to Babylonia, where he later died in prison.

and becoming worthless like them:
that they did not ask, "Where is the Lord,
who brought us up from Egypt
and led us through the wilderness,
through a barren and broken country,
a country parched and forbidding,
where no one ever traveled,
where no one made his home?
I brought you into a fertile land to enjoy its fruit
and every good thing in it,
but when you entered my land you defiled it
and made loathsome the home I gave you.
The priests no longer asked, 'Where is the Lord?'
Those who handled the law had no real knowledge of me,
the shepherds of the people rebelled against me;
the prophets prophesied in the name of Baal
and followed gods who were powerless to help.
(Jeremiah 2:4-8)

Stop before your feet are bare and your throat is parched.
But you said, 'No, I am desperate.
I love foreign gods and I must go after them.

As a thief is ashamed when he is found out
so the people of Israel feel ashamed,
they, their kings, their princes, their priests, and their prophets,
who say to a block of wood, 'You are our father'
and cry 'Mother' to a stone.
On me they have turned their backs
and averted their faces from me.
Yet in their time of trouble they say,
'Rise up and save us!'
Where are the gods you made for yourselves?
In your time of trouble let them arise and save you.
For you, Judah, have as many gods as you have towns.
(Jeremiah 2:25-28)

Israel, I am bringing against you a distant nation,
an ancient people established long ago, says the Lord,
a people whose language you do not know,
whose speech you will not understand;

Once again the Lord spoke to me; he said:
Because this nation has rejected the waters of Shiloah,
which flow softly and gently,
therefore the Lord will bring up against it
the mighty flood waters of the Euphrates.
The river will rise in its channels and overflow all its banks.

In a raging torrent mounting neck-high it will sweep through Judah.
With his outspread wings
the whole expanse of the land will be filled,
for God is with us.

Take note, you nations; you will be shattered.
Listen, all you distant parts of the earth:
arm yourselves, and be shattered;
arm yourselves, and be shattered.

Devise your plans, but they will be foiled;
propose what you will, but it will not be carried out;
for God is with us.

(Isaiah 8:5-10)

Then came Prophet Jeremiah, who tried to shake his people out of their perverted ways, idolatry, and apostasy, during the period 627 BC to 587 BC. His sermons, however, met with an intense opposition from a corrupt society that was addicted to idol-worship to the point of fanaticism. His teachings were later collected as the "Book of Jeremiah" in the Old Testament, from which the following excerpts are taken:

Listen to the words of the Lord, people of Jacob, all you families of Israel.
These are the words of the Lord:

What fault did your forefathers find in me,
that they went so far astray from me,
pursuing worthless idols

associated rituals of licentious dances remained irresistibly attractive for the austere Israelites.

At last. Almighty God's anger manifested itself in the form of Assyrians from the north, whose takeover of Israel started gradually but ended with severe subjugation. Initially, the kings of Israel were forced to pay tribute money to Assyria, but in 721 BC, the Assyrian armies, under king Sargon, attacked and plundered Samaria, killing thousands of her inhabitants. According to an Assyrian inscription, King Sargon carried away 27,290 Israelites into captivity, and scattered them in his eastern provinces. This ended the existence of the northern kingdom as an independent nation.

On the other hand, the history of the southern state of Judah displays a relatively slower degeneration in beliefs and morality. However, they too started to indulge in idol-worship and transgressions of the Divine Law, becoming more and more corrupt with every passing generation. Prophet Isaiah rose and tried to reform his people during the period 740 BC to 700 BC His warnings and prophecies -- which were collected in the "Book of Isaiah" of the Old Testament -- clearly testify to the moral decadence of his times. Here area a few statements from his sermons:

> You sinful nation, a people weighed down with iniquity,
> a race of evildoers, children whose lives are depraved,
> who have deserted the Lord, spurned the Holy One of Israel,
> and turned your backs on him!
> Why do you invite more punishment, why persist in your defection?
> Your head is all covered with sores, your whole body is bruised;
>
> (Isaiah 1:4,5)
>
> Your rulers are rebels, associates of thieves;
> every one of them loves a bribe and chases after gifts;
> they deny the fatherless their rights
> and the widow's cause is never heard.
>
> (Isaiah 1:23)

Dr. Ahmed Afzaal

LESSONS FROM HISTORY-III

Based on the Urdu Columns By: **Dr. Israr Ahmad**

First Period of Decline

The death of Prophet Solomon marks the beginning of the first period of decline for the Israelites. The united monarchy disappeared, and in its place arose two kingdoms -- Israel in the north and Judah in the south. The people of the northern kingdom crowned Jeroboam, an official who had rebelled against Solomon and taken refuge in Egypt, and he made Shechem his royal city. The southern kingdom continued to be ruled by the Davidic dynasty, its first monarch being Rehoboam, son of Prophet Solomon, with its center at Jerusalem.

Although both kingdoms were strife-ridden from the very beginning, Israel was especially turbulent because of its large population who seldom agreed on anything. Politically unstable, the northern kingdom suffered a prolonged period of internal warfare until 876 BC, when an army officer Omri got hold of the throne and built a new capital at Samaria. He, however, adopted a policy of compromise with paganism, as a result of which the common people began to assimilate various polytheistic practices of the neighboring communities. The rise of paganism became especially serious under Omri's son Ahab, who married a Phoenician princess, Jezebel. She started a ruthless campaign to wipe out Israel's traditional monotheism, and to replace it with the Canaanite fertility cult and the worship of Baal. Two prophets, Elijah (or *Elias*) and Elisha (or *Al-Yasa*), rose and tried their best to warn their people, and to check their growing inclination towards paganism, but the cult of Baal and the

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں "بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر" کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

جو کئی سال سے آؤٹ آف پرنٹ تھی'

اب اس کتاب کا نیا نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن نئی آب و تاب کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے' جس میں مندرجہ ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے :

- فکر اقبال کی روشنی میں حالات حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں

از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد

- حیات و سیرت اقبال
- فلسفہ اقبال
- ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

- اقبال اور قرآن' از قلم : سید نذیر نیازی

عمدہ کتابت' دیدہ زیب طباعت' صفحات ۱۴۴

قیمت : اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) ۷۲ روپے

اشاعت عام (نیوز پیپر ایڈیشن) ۳۰ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن